AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جدید اُردو نظم کا موضوعاتی تنوع

(شکیب جلالی، مصطفیٰ زیدی، مجید امجد، ظہور نظر، فیض احمد فیض، حبیب جالب اور منیر نیازی) کی تخصیص کے ساتھ

Naseer Ahmad
PhD Urdu Scholar Qurtuba University D.I Khan
Dr. Muzammil Hussain
Department of Urdu Linguistics and Literature Qurtuba University D.I Khan

Abstract

Modern Urdu poetry is characterized by a rich diversity of themes, poetic attitudes, styles, and modes of expression that reflect the complex realities of individual and collective life. This research paper, entitled "Thematic Diversity in Modern Urdu Poetry (جدید اردو نظم کا موضوعاتی تنوع)",explores the thematic richness of modern Urdu poetry with particular reference to the poetic works of Shakib Jalali, Mustafa Zaidi, Majeed Amjad, Zahoor Nazar, Faiz Ahmed Faiz, Habib Jalib, and Munir Niazi. Although these poets belong to a shared literary tradition, each possesses a distinctive poetic sensibility, tone, diction, and stylistic approach through which they interpret and represent human experiences and social realities. The primary objective of this study is to examine the diversity of themes in their poetry and to investigate how their individual poetic styles contribute to the expansion of thematic possibilities in modern Urdu poetry. The study focuses on a wide range of themes, including romantic love, political and social consciousness, economic disparities, existential anxiety, loneliness, personal inadequacy, disillusionment, and the experiences of state oppression and political injustice. It also explores the ways in which these poets articulate the tensions between individual emotions and collective experiences, personal aspirations and social constraints, and hope and despair. While some poets emphasize the psychological complexities of human existence and the sense of alienation in modern life, others employ poetry as a medium of resistance, social criticism, and political awareness. Their distinctive use of language, imagery, symbolism, and poetic expression lends multiple dimensions to these themes. Through a thematic and comparative examination of their poetic approaches, this research seeks to highlight both the individual characteristics of these poets and their collective contribution to the development of modern Urdu poetry. The study ultimately aims to demonstrate that thematic diversity, combined with stylistic innovation and a profound engagement with human experience, constitutes one of the defining features of modern Urdu poetry.

Keywords: *Jadeed Urdu Nazm, Mauzooati Tanawwu, Shakib Jalali, Mustafa Zaidi, Majeed Amjad, Zahoor Nazar, Faiz Ahmed Faiz, Habib Jalib, Munir Niazi, Romaniyat, Siyasi Shaoor, Samaji Shaoor, Maashi Na-Hamwari, Ehsas-e-Tanhai, Ehsas-e-Kam-Maayegi, Wajoodi Bechaini, Riyasati Jabr, Samaji Na-Insafi, Shaerana Asloob.*

اردو ادب کی تاریخ میں بیسویں صدی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس صدی میں جہاں اردو ادب کے مختلف اصناف میں فکری و فنی سطح پر نئے تجربات سامنے آئے، وہاں نظم نے بھی اپنے موضوعات، اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نئی جہت اختیار کی۔ اگرچہ جدید اردو نظم کے ابتدائی نقوش تحریکِ علی گڑھ کے زیرِ اثر نمایاں ہونا شروع ہو گئے تھے، تاہم بیسویں صدی میں اس صنف نے جس وسعت، تنوع اور فکری بالیدگی کا مظاہرہ کیا، وہ اردو ادبی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ سرسید تحریک نے اردو

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

شاعری کو روایتی موضوعات اور فرسودہ تصورات سے نکال کر زندگی کے حقیقی مسائل، سماجی شعور، اصلاحِ معاشرہ اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بنیاد فراہم کی۔ بعد ازاں مختلف ادبی تحریکوں اور فکری رجحانات نے جدید اردو نظم کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا اور اسے اظہار و ابلاغ کا ایک مؤثر وسیلہ بنا دیا۔

بیسویں صدی میں جدید اردو نظم کا موضوعاتی دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع ہوا۔ اس دور کے شعرا نے محض حسن و عشق اور ذاتی جذبات و احساسات تک اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ زندگی کے انفرادی، اجتماعی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، نفسیاتی اور فلسفیانہ مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر نظم میں طبقاتی کشمکش، استحصال، غربت، مزدوروں اور کسانوں کے مسائل، آزادی، انقلاب اور انسانی مساوات جیسے موضوعات کو نمایاں اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت کے زیرِ اثر فرد کی داخلی کیفیات، تنہائی، ذات کی شکست و ریخت، وجودی اضطراب، شعور و لاشعور، علامت اور تجرید جیسے موضوعات نے نظم کے افق کو مزید وسعت دی۔ قومی و ملی احساسات، تقسیمِ ہند کے المیے، ہجرت، جنگ، امن، محبت، فطرت، انسانی رشتوں کی پیچیدگی اور تہذیبی زوال بھی جدید اردو نظم کے اہم موضوعات میں شامل رہے۔

شکیب جلالی:

اگرچہ شکیب جلالی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر انھوں نے جو نظمیں لکھیں وہ بھی کمال کی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو نظم کے منظرنامے پر متعدد ایسے شعرا سامنے آئے جنھوں نے روایتی اسالیب سے ہٹ کر نئے موضوعاتی امکانات کو تلاش کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو نظم کے فکری و موضوعاتی افق پر ابھرنے والے اہم شعرا کا ذکر کرتے ہوئے ذوالفقار احسن لکھتے ہیں:

> ”قیامِ پاکستان سے قبل اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جن شعرا نے اردو نظم میں اپنا نام کیا ان میں فیض احمد فیض، ن م راشد، قیوم نظر، مجید امجد، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، جعفر طاہر، مختار صدیقی، ظہیر کاشمیری، وزیر آغا، ضیا جالندھری، ظہور نظر، جیلانی کامران، ساقی فاروقی، سلام جیلانی، اصغر جیلانی، شکیب جلالی اور عزیز حامدنی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔“[۱]

اس تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ شکیب جلالی کا شمار ان اہم شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد اردو نظم کی نئی موضوعاتی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالا۔ اگرچہ شکیب جلالی بنیادی طور پر غزل کے ممتاز شاعر مانے جاتے ہیں اور عین شباب میں انتقال کر جانے کے باعث ان کا نظم نگاری کا سرمایہ مختصر ہے، مگر موضوعاتی اعتبار سے اس میں بے پناہ وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے۔ شکیب جلالی کی شاعری کی بنیادی فکری جہتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے صمامت وقار رقم طراز ہیں:

> ”شکیب جلالی کی شاعری ویسے تو بے شمار عناصر سے مل کر تشکیل پاتی ہے مگر دو عناصر اس میں بہت واضح ہیں اور اپنے جداگانہ تشخص کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ اوّلاً تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کا شعور اور ثانیاً زندگی کے مختصر ہونے کا احساس۔“[۲]

ناقد کی اس گفتگو سے یہ نقطہ برآمد ہوتا ہے کہ وقت کی بے رحم روی اور انسانی زندگی کی ناپائیداری شکیب کے شعری وجدان کا بنیادی حصہ ہے۔ یہی وقت کا تیز رفتار شعور اور زوالِ حیات کا احساس ان کی نظموں کو ایک الگ فکری جہت عطا کرتا ہے، جیسے وہ اپنے ان اشعار میں زندگی کی بے یقینی اور وقت کے طوفان کو موضوع بناتے ہیں:

آج کی بات دو، کل پر نہ ٹال
جانیں ہم کل تک جئیں کہ مرے
تیرے وعدے پہ اعتبار تو ہے
زیست پر اعتبار کون کرے[۳]

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ان اشعار میں شاعر نے محبت کے جذبے کو بھی وجودی بے یقینی اور موت کے احساس سے جوڑ کر پیش کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ہاں شخصی جذبات بھی عالمی اور انسانی مسائل کا روپ دھار لیتے ہیں۔

شکیب جلالی کا موضوعاتی دائرہ محض ذات کی شکستگی اور داخلی المیے تک محدود نہیں بلکہ اس میں تاریخی، مذہبی اور قومی شعور بھی گہرائی کے ساتھ شامل ہے۔ واقعۂ کربلا اور حق و باطل کی کشمکش کو وہ ایک مستقل انسانی اخلاقی استقامت کے استعارے کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس کا ثبوت ان کی اس نظم سے ملتا ہے:

نہ زلزلوں سے ہراساں نہ آندھیوں سے ملول
مثالِ کوہ تھے دشتِ بلا میں سبطِ رسول
وہ زخم پائے مبارک، وہ برچھیاں، وہ ببول
وہ العطش کی صدائیں، وہ تپتی ریت، وہ دھول
امتحان بھی گوارا، وہ امتحاں بھی قبول! ۴

ان مصرعوں کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شاعر کربلا کو محض ایک تاریخی واقعہ نہیں مانتا بلکہ اسے ہر عہد میں باطل کے سامنے ڈٹ جانے کی فکری علامت قرار دیتا ہے۔ اسی تسلسل میں وہ حسینیت کو ہر دور میں زندہ و جاوید حقیقت کے طور پر یوں قلم بند کرتے ہیں:

ہزار ظلم و تشدد کی آندھیاں آئیں
کسی طرح نہ مٹا دہر سے نشانِ حسین
لبوں پہ کلمۂ حق ہے، دلوں میں ذوقِ جہاد
جہاں میں آج بھی رہتے ہیں ترجمانِ حسین ۵

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ شکیب کے ہاں مذہبی و تاریخی شخصیات کا ذکر عقیدت کے ساتھ ساتھ حق گوئی اور ظلم کے خلاف مزاحمت کی تحریک کا باعث بنتا ہے۔

تاریخی شعور کی اس روشنی میں شکیب جلالی تحریکِ آزادی کے رہنماؤں اور قوم کے معماروں کی خدمات کو بھی موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ نظم "بیادِ قائداعظم" میں وہ جہاں قائد کی عظیم قیادت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

کفِ صبا پہ مہکتا ہوا گلاب تھا وہ
روش روش تری خوشبو سے مشکبار ہوئی
کرن کرن ترے پرتو سے تابدار ہوئی
کفِ صبا پہ مہکتا ہوا گلاب تھا وہ ۶

یہاں قائداعظم کی شخصیت کی جمالیاتی اور معنوی حاکمیت کا اعتراف سامنے آتا ہے، لیکن شاعر محض مدح پر نہیں رکتا بلکہ قوم کی موجودہ حالت پر خود احتسابی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے:

نگارِ موسمِ گل کی جبیں کا داغ ہیں ہم
ہمیں سے لالہ و گل کی قبا رفو نہ ہوئی
ہمیں سے زحمتِ تائیدِ رنگ و بو نہ ہوئی
نگارِ موسمِ گل کی جبیں کا داغ ہیں ہم ۷

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

شاعر کے اس حسرت ناک اعتراف سے یہ سچائی سامنے آتی ہے کہ قوم نے آزادی کے مقاصد اور قائد کی امانت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا، جسے وہ اپنے اس سوالیہ شعر میں مزید گہرا کر دیتے ہیں:

مہ و نجوم کے جھرنوں پہ نوحہ خواں ہوتے
تجھے جو خضر سمجھتے تو ہم یہاں ہوتے؟ ۸

ان مصرعوں کی تہہ میں پوشیدہ قومی ندامت اور حسرت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ شکیب جلالی کا قلم قومی سیاسی زوال پر کس قدر نوحہ کناں ہے۔

مصطفیٰ زیدی موضوعات:

مصطفیٰ زیدی جدید اردو نظم کے ایک ایسے اہم اور منفرد شاعر ہیں جن کی شاعری میں رومان، داخلی کرب، سماجی شعور اور فکری گہرائی کا دلکش امتزاج ملتا ہے۔ ان کی نظم نگاری کا بنیادی امتیاز اس کی موضوعاتی وسعت، فکری تنوع اور عصری حقیقتوں سے گہرا ربط ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی شخصیت اور فکری تشکیل پر ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور نظریاتی رجحانات کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ طالب علمی کے زمانے میں ترقی پسند اور اشتراکی لٹریچر کے مطالعے نے ان کے فکری رویوں میں گہری تبدیلی پیدا کی اور وہ مذہب، روایت اور سماجی جمود کے بارے میں تنقیدی سوالات اٹھانے لگے۔ ان کی ابتدائی فکری بے چینی اور نظریاتی پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں:

> "اب وہ زمانہ تھا جب مصطفیٰ زیدی اور اس کے دوستوں نے کمیونسٹ پارٹی میں دلچسپی لینا شروع کی اور خوب لٹریچر پڑھ ڈالا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ مذہب کے خلاف تو وہ پہلے ہی تھا، اب اسے یہ بھی پتا چلا کہ مذہب انسان کو روایات کا پابند کر کے مردہ بناتا ہے۔ اب اور شدت سے مذہب کی مخالفت شروع کر دی۔ علی سردار جعفری کی کمیونسٹ خیالات کی پرچارک نظم 'نئی دنیا کو سلام' کالج سمیپس میں زور زور سے پڑھی اور مذہب کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا جاتا۔"9

اس اقتباس کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مصطفیٰ زیدی کی فکری شخصیت کی تشکیل میں ان کے عہد کے ترقی پسند اور نظریاتی رجحانات نے بنیادی کردار ادا کیا۔ تاہم ان کی شاعری کو کسی ایک نظریے تک محدود نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ فکری بے چینی آگے چل کر ان کے موضوعاتی سفر کا ابتدائی زینہ بنی۔

مصطفیٰ زیدی کے اس موضوعاتی ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو ان کا پہلا شعری مجموعہ "روشنی" خصوصیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے ابتدائی شعری رجحانات کا غلبہ ہے جہاں رومانویت، حسن و عشق، نوجوان دل کی کیفیات اور زندگی کے جمالیاتی تجربات نمایاں ہیں۔ اپنے اس ابتدائی شعری مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مصطفیٰ زیدی "روشنی" کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

> "روشنی کے پہلے ایڈیشن میں جو نعرے بازی کی چند نظمیں تھیں، ان کی فضا رومانوی تھی اور انہوں نے مجھے مقام شعر کے صحیح ادراک سے بہت زیادہ دور نہیں کیا۔"10

شاعر کا یہ اعتراف اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ "روشنی" کا بنیادی محور رومانوی فضا ہے، جہاں محبت محض ایک سطحی جذبہ نہیں بلکہ حیات کے معنوی احساس سے جڑی ہوئی ہے۔ زیدی کے ہاں محبت کے ساتھ ہجر، محرومی اور المیہ بھی شامل ہو جاتا ہے اور محبوب کی عدم موجودگی میں پوری کائنات بے نور دکھائی دینے لگتی ہے، جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

اس سے اک لمحہ الگ رہ کے جنوں ہوتا تھا
جی میں تھی، اس کو نہ پائیں گے تو مر جائیں گے
وہ نہیں ہے تو یہ بے نور زمانہ کیا ہے

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

تیرگی میں کسے ڈھونڈیں گے، کدھر جائیں گے 11؎

ان اشعار کے گہرے ادراک سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ زیدی کے ہاں رومانوی جذبہ بھی وجودی تلخیوں اور محرومی کے احساس سے دامن بچا کر نہیں گزرتا، بلکہ یہی رومانوی تجربہ آگے چل کر ان کے شعری دائرے کو وسیع تر انسانی اور معاشرتی مسائل سے جوڑنے کا باعث بنتا ہے۔

بعد کے شعری مجموعوں، بالخصوص "شہر آذر" میں زیدی کا موضوعاتی دائرہ محض ذات کی دنیا سے نکل کر گہرے فکری و معاشرتی ابعاد میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں مایوسی، ناانصافی پر تنقید، داخلی کرب اور سماجی منافقت کے موضوعات ابھرتے ہیں۔ اپنے اس بدلتے ہوئے شعری و فکری زاویے کی وضاحت کرتے ہوئے مصطفیٰ زیدی رقم طراز ہیں:

> "ان نظموں میں دیکھنے سے زیادہ سوچنے اور چھونے سے زیادہ محسوس کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ مجھے مادی اور غیر مادی چیزوں میں ان کی معیت اتنی عزیز نہیں جتنی کہ ان کی مادیت اور ماہیت عزیز ہے، لیکن میں خیال کی تلاش میں تارے سے نہیں بھاگتا۔" 12؎

مصطفیٰ زیدی کا یہ بیان اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی شاعری میں محض خیالی تصورات کے بجائے مادی و معاشرتی حقائق کا ادراک بنیادی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں ذاتی کرب اور انسانی المیہ باہم مربوط ہو کر ایک وسیع تر فکری دھارے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جیسا کہ ان کی نظم "تخلیق" میں دیکھا جا سکتا ہے:

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر کر ہم نے
اس قدر سلسلۂ سود و زیاں دیکھے ہیں
رات کٹتے ہی بکھرتے ہوئے تاروں کے کفن
جھومتی صبح کے آنچل میں نہاں دیکھے ہیں
جاگتے ساز، دمکتے ہوئے نغموں کے قریب
چوٹ کھائی ہوئی قسمت کے سماں دیکھتے ہیں
ڈوبنے والوں کے ہمراہ بھنور میں رہ کر!
دیکھنے والوں کے اندازِ بیاں دیکھے ہیں
مدتوں اپنے دلِ زار کا ماتم کر کے
خود سے بڑھ کر بھی کئی سوختہ جاں دیکھتے ہیں 13؎

ان مصرعوں کی معنوی تہوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے ہاں ذات کا دکھ اب عالمگیر انسانی کرب کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ صرف اپنی محرومی پر نوحہ کناں نہیں ہوتے بلکہ دوسروں کے دکھ درد کو بھی اپنے شعری وجدان میں سمو لیتے ہیں۔

ذاتی کرب اور انسانی المیے سے آگے بڑھ کر مصطفیٰ زیدی کے موضوعاتی تنوع میں سیاسی جبر، ضمیر فروشی اور حق گوئی کے خلاف مزاحمت کا عنصر بھی پوری شدت سے ابھرتا ہے۔ ان کی نظم "گستاپو" اسی سیاسی و معاشرتی احتجاج کا ایک بہترین استعارہ ہے، جہاں شاعر ظلم کے نظام کے سامنے ڈٹ جانے اور حق کا علم بلند کرنے کا عزم ظاہر کرتا ہے:

حقیر جاہ و حشم کے حصول کے بدلے
دل و دماغ دئے ہیں ضمیر بیچا ہے
میں معترف ہوں کہ ہے میرا جرم حق گوئی

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مگر یہ مخبری حق گناہ ہے کہ نہیں
تری غذا میں شہیدوں کا خون شامل ہے
ترا وجود تعفن کا دودھ پیتا ہے
درندگی کے مقدر پہ ناچنے والے
درندگی کا مقدر بدلتا رہتا ہے 14؎

شاعر کے اس حتمی اور للکارتے ہوئے لہجے سے یہ سچائی سامنے آتی ہے کہ ان کی نظر میں جبر واستبداد کا نظام ابدی نہیں ہے بلکہ حق گوئی اور انسانی مزاحمت کے ذریعے اس کا خاتمہ یقینی ہے۔یہی سیاسی و تاریخی شعور ان کی نظم "اگست ۴۷" میں بھی ابھرتا ہے، جہاں وہ قیامِ پاکستان کے تاریخی واقعے کو محض سیاسی تبدیلی ماننے کے بجائے ایک نیا عبوری عہد قرار دیتے ہیں جس کے ساتھ ماضی کے باقی ماندہ اثرات اور مستقبل کی امیدیں یکجا ہیں:

ابھی غبارِ سرِ کارواں نہیں بیٹھا
عروسِ شب کی سواری گزر گئی ہے ضرور
ابھی بہت سے سویروں کو اوس پینی ہے
کسی کے پھول کی رنگت نکھر گئی ہے ضرور 15؎

علاماتی سطح پر لکھے گئے ان اشعار کی تفہیم سے یہ نقطہ روشن ہوتا ہے کہ شاعر آزادی کو ایک جاری ارتقائی عمل سمجھتا ہے جس میں ماضی کی تلخیاں ابھی باقی ہیں مگر مستقبل کے روشن امکانات بھی جلوہ گر ہو رہے ہیں۔

مجید امجد:

مجید امجد اردو نظم کے ماتھے کا جھومر ہیں، انھوں نے موضوع، ہیئت اور لفظیات کے حوالے سے اُردو نظم کو ایک وقار بخشا۔ مجید امجد کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف اس کا موضوعاتی تنوع اور فکری وحدت ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کے مختلف مظاہر، انسانی وجود، فطرت، وقت، تہذیب، تاریخ، سماجی ناہمواری، انسانی اقدار، محنت کش طبقہ، دیہی زندگی، کائناتی شعور اور فرد کی داخلی کیفیات اس انداز سے یکجا ہو جاتی ہیں کہ ایک موضوع دوسرے موضوع سے الگ دکھائی نہیں دیتا بلکہ باہم مربوط فکری نظام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجید امجد کی نظم محض کسی ایک تجربے یا احساس کی ترجمان نہیں بلکہ انسانی زندگی کی ہمہ گیر تعبیر بن جاتی ہے۔ ان کے ہاں مختلف موضوعات محض الگ الگ عنوانات کے تحت سامنے نہیں آتے بلکہ ایک مربوط فکری کل کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ اس فکری وحدت اور موضوعاتی ربط کی توضیح کرتے ہوئے سید عامر سہیل رقم طراز ہیں:

> "ان کی نظم اور اس کے موضوعات ایک دھارے میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ موضوعات کی تہ در تہ سطحیں ہیں جو بظاہر متداخل ہوتی محسوس ہوتی ہیں مگر درحقیقت ان کے یہاں موضوعات تنہا حیثیت رکھنے کی بجائے داخلی سطح پر ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں۔ عہد، سماج، روایت اور ذات کے متعلقات میں باہمی ہم آہنگیوں کا گہرا تعلق ہے، جو مختلف رموز اور نشانات کے ذریعے اپنی انفرادی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔"16؎

اس تنقیدی بصیرت سے یہ حقیقت مزید روشن ہو جاتی ہے کہ مجید امجد کے ہاں انسان دوستی، فطرت نگاری، وقت کا شعور، سماجی ناانصافیاں، تہذیبی زوال، قومی زندگی، محنت کی عظمت، دیہی ثقافت اور وجودی فکر ایک دوسرے سے پیوست ہو کر شاعر کے وسیع انسانی اور جمالیاتی وژن کو تشکیل دیتے ہیں۔ یہی داخلی ربط مجید امجد کی موضوعاتی انفرادیت کا بنیادی وصف ہے جو ان کی نظم کو جدید اردو شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

مجید امجد کے اس موضوعاتی تنوع میں تاریخی شعور کو بنیاد بناتے ہوئے جب زمانے کی سفاک گردش پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کو محض گزرے ہوئے واقعات کا سلسلہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے انسانی تہذیب، ظلم و استحصال، ارتقا اور مسلسل کشمکش کی علامت قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زمانہ ہمیشہ تغیر پذیر رہا ہے، لیکن ظلم، جبر اور طاقت کی ہوس مختلف صورتوں میں ہر دور میں موجود رہی ہے۔ اسی تاریخی شعور کو شاعر نے نظم "رودِ زمانہ" میں نہایت گہرے علامتی انداز میں پیش کیا ہے:

"ہم نے دیکھا ہے یہی کچھ کہ ہر اک دورِ زماں
برف زاروں سے پھسلتی ہوئی صدیوں کا خروش
کھولتے لاوے میں جلتے ہوئے قرنوں کا دھواں"17؎

ان اشعار میں مجید امجد انسانی تاریخ کے مسلسل بہاؤ، تہذیبوں کے عروج و زوال اور زمانے کی پے در پے کشمکش کو علامتی پیکروں میں بیان کرتے ہیں۔ "برف زاروں" اور "کھولتے لاوے" کی تصویریں اس حقیقت کی نمائندگی کرتی ہیں کہ تاریخ کبھی سکون اور کبھی شدید اضطراب سے عبارت رہی ہے۔ یوں یہ نظم اس تصور کو تقویت دیتی ہے کہ زمانے کی گردش میں ظلم و مزاحمت، تعمیر و تخریب اور انسانی جدوجہد ایک دائمی حقیقت ہیں، جس کے باعث تاریخی شعور مجید امجد کی شاعری کے اہم ترین موضوعات میں شمار ہوتا ہے۔

تاریخ کے اس مسلسل الجھاؤ اور زمان و مکان کی کشمکش کے باوجود مجید امجد کا فکر مایوسی کے اندھیروں میں گم نہیں ہوتا، بلکہ وہاں سے امید اور حیات آفرینی کا ایک نیا سلسلہ جنم لیتا ہے۔ جہاں تاریخ کے جبر، تہذیبی کشمکش اور زمانے کی سفاکی کا شعور نمایاں ہے، وہیں وہ زندگی کی بقا، خیر کی قوت اور امید کے استعاروں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاریخ کے بڑے سے بڑے طوفان بھی انسانی حوصلے، حسن اور زندگی کی لطیف قدروں کو مکمل طور پر مٹا نہیں سکتے۔ یہی تصور اسی نظم "رودِ زمانہ" کے اگلے حصے میں نہایت مؤثر انداز میں سامنے آتا ہے:

"ہاں اسی طرح سرِ سطحِ سوادِ ایام!
بارہا جنبشِ یک موج کے ہلکورے میں
بہ گئے غولِ بیاباں کے گراں ڈیل اجسام
بارہا تند ہوائیں چلیں، طوفاں آئے
لیکن اک پھول سے چمٹی ہوئی تتلی نہ گری"18؎

ان اشعار میں شاعر اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ زمانے کے شدید انقلابات، طاقت ور قوتوں اور تباہ کن طوفانوں کے باوجود زندگی کی نازک مگر مثبت قدریں ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔ "پھول" اور "تتلی" حسن، محبت، امید اور حیاتِ انسانی کی علامتیں ہیں، جو اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ خیر اور جمال کی قوتیں جبر و استبداد سے زیادہ پائیدار ہوتی ہیں۔ اس طرح مجید امجد تاریخ کے تاریک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے روشن امکانات کو بھی نمایاں کرتے ہیں، جو ان کی شاعری کے موضوعاتی تنوع میں امید، حیات آفرینی اور انسانی بقا کے تصور کو ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔

اسی حیات آفریں فکر کی ایک عملی صورت فرسودہ سماجی نظام اور معاشرتی جمود کے خلاف احتجاج کی شکل میں ابھرتی ہے۔ مجید امجد کے موضوعاتی کینوس میں سماجی ناانصافی اور انسانی محرومیوں کے خلاف آواز اٹھانا ایک نمایاں عنصر ہے۔ وہ ایسے معاشرے پر تنقید کرتے ہیں جہاں ظلم، بے حسی اور ناانصافی نے زندگی کی رونقیں چھین لی ہوں۔ ان کے نزدیک ایک ایسا نظام، جو انسان کو امید، خوشی اور وقار سے محروم کر دے، تبدیلی کا متقاضی ہے۔ اسی احساس کو وہ نظم "دور تو؟" میں نہایت مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں:

"زندگانی کا یہ فرسودہ نظام!
آنسوؤں کی صبح اور آہوں کی شام

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اس نظامِ کہنہ کو بدلے کوئی"19؎

ان اشعار میں مجید امجد ایک ایسے معاشرتی اور تہذیبی نظام کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو انسان کو مسلسل دکھ، محرومی اور مایوسی سے دوچار رکھتا ہے۔ "آنسوؤں کی صبح" اور "آہوں کی شام" انسانی زندگی کے دائمی کرب اور اجتماعی بے بسی کی علامتیں ہیں، جبکہ "اس نظامِ کہنہ کو بدلے کوئی" ایک بہتر، منصفانہ اور انسان دوست معاشرے کی خواہش کا اظہار ہے۔ اس طرح یہ نظم مجید امجد کے انقلابی شعور، سماجی آگہی اور اصلاحِ معاشرہ کے تصور کی مؤثر ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔

جب اسی انقلابی اور اصلاحی شعور کو خصوصی طور پر پاکستانی معاشرتی تناظر میں دیکھا جائے تو امید اور حیات دوستی کا یہ پہلو مزید معنی خیز ہو جاتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں سیاسی عدم استحکام، معاشی مشکلات، سماجی بے یقینی اور عوامی مسائل کے باوجود عام آدمی کی زندگی کسی نہ کسی امید کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔ اگرچہ وہ زندگی کی تلخیوں اور انسانی محرومیوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں، لیکن مایوسی کو کبھی حتمی حقیقت کے طور پر قبول نہیں کرتے۔ مجید امجد اسی انسانی نفسیات اور اجتماعی احساس کو نظم "افتاد" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں ان سہاروں کو
پھر بھی جینے کا اک بہانہ تو ہو"20؎

ان اشعار میں شاعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ انسان زندگی کے سہاروں کی کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔ پاکستانی تناظر میں یہ اشعار ان لاکھوں افراد کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں جو معاشی تنگی، بے روزگاری، سیاسی بے یقینی اور سماجی مسائل کے باوجود بہتر مستقبل کی امید پر زندگی کا سفر جاری رکھتے ہیں۔ یہی امید اور حوصلہ فرد اور معاشرے دونوں کو مایوسی سے بچا کر آگے بڑھنے کی قوت فراہم کرتا ہے، جو ہر دور خصوصاً ہمارے مقامی تناظر میں اپنی معنویت برقرار رکھتا ہے۔

اجتماعی زندگی کے ان مظاہر کی توسیع مجید امجد کے ہاں دیہی زندگی، محنت کش طبقے اور زرعی تہذیب کی ترجمانی تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کسان، مزدور اور دیہات کے عام انسان کو محض شعری کردار نہیں بناتے بلکہ اسے معاشرتی زندگی کی اصل قوت اور تہذیبی شناخت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں زمین سے وابستگی، محنت کی عظمت، اجتماعی خوش حالی اور فطرت کے ساتھ انسان کے رشتے کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ نظم "بیساکھ" اسی موضوع کی نمائندہ نظم ہے، جس میں شاعر نے دیہی معاشرے کی زندگی، کسان کی محنت اور فصل کی آمد سے وابستہ تہذیبی و سماجی شعور کو اجاگر کیا ہے:

"بیساکھ آیا، آئی فسوں زائیوں کی رُت
آئی حسین کلیوں کی برنائیوں کی رُت!" 21؎

یہ نظم اس حقیقت کی غماز ہے کہ مجید امجد کے نزدیک دیہی زندگی اور محنت کش انسان اردو شاعری کے بنیادی موضوعات میں شامل ہیں۔ وہ زرعی معاشرے کو قومی زندگی کی بنیاد اور کسان کو معاشی و سماجی استحکام کا حقیقی معمار تصور کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محنت، امید، اجتماعی فلاح اور زمین سے وابستگی کا تصور بار بار نمایاں ہوتا ہے، جو ان کے انسان دوست اور حقیقت پسندانہ شعری رویّے کا مظہر بنتا ہے۔

تاہم معاشرتی زندگی کی اس رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ مجید امجد کا قلم انسانی غفلت، بے حسی اور جمود پر بھی گہرا نقد کرتا ہے۔ ان کی نظم "پکار" کا بنیادی موضوع انسان کو غفلت، خود فریبی اور خوابِ غفلت سے نکال کر حقیقت کا سامنا کرنے کی دعوت دینا ہے۔ شاعر ایک معمولی پرندے کی علامت کے ذریعے انسانی زندگی کی ناپائیداری اور ہر لمحہ منڈلاتے ہوئے خطرات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پرندہ بجلی کے تار پر بیٹھا ہوا گویا موت کے سائے میں زندگی گزار رہا ہے، لیکن شاعر کی للکار سنتے ہی اڑ جاتا ہے، جبکہ انسان اپنی تباہ کن صورتِ حال کے باوجود غفلت کی نیند میں ڈوبا رہتا ہے:

"بجلی کے اک تار پہ آ کر بیٹھ گئی ہے
موت کا جھولا جھول رہی ہے

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

میرے دل سے اک اُبھری میں للکارا

...

اور اک تم ہو

انگاروں پر بیٹھے ہو اور پھولوں کے سپنوں میں گم ہو

میرے دل کی اک اک چیخ تمھیں بے سود پکارے۔"22؎

ان اشعار میں مجید امجد نے بتایا ہے کہ ایک چھوٹا سا پرندہ بھی خطرے کو محسوس کر کے اپنی جان بچا لیتا ہے، مگر انسان ظلم، ناانصافی، اخلاقی زوال اور معاشرتی بحران جیسے "انگاروں" پر بیٹھا ہونے کے باوجود خیالی آسائشوں میں گم رہتا ہے۔ شاعر کی پکار دراصل اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش ہے، لیکن افسوس کہ اس کی صدائیں بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ پاکستانی تناظر میں یہ نظم معاشرتی بے حسی، سیاسی جمود اور قومی مسائل کے مقابلے میں عوام کی غفلت پر ایک فکری تبصرہ بن جاتی ہے۔

ظہور نظر:

اُردو نظم کے تناظر میں ظہور نظر کی شاعری محض ذاتی یا مقامی احساسات کا احاطہ نہیں کرتی، بلکہ ان کا انقلابی شعور ایک آفاقی سچائی بن کر ابھرتا ہے۔ وہ ظلم، ناانصافی اور جبر کے خلاف جدوجہد کو انسانی وقار کی آفاقی قدر تسلیم کرتے ہیں۔ تاریخی اور عالمگیر استعاروں کی مدد سے وہ ایک ایسی بین الاقوامی مزاحمتی روایت کو اپنی نظموں کا حصہ بناتے ہیں جو ہر دور کے مظلوم کی آواز بنتی ہے:

یہ رہگزر۔۔۔ جس پر کربلا کے مسافروں کے نقوشِ پا ہیں

یہ رہگزر۔۔۔ جس پر بیٹھ کر زہر کا پیالہ لبوں سے سقراط نے لگایا

یہ رہگزر۔۔۔ جس پر اس صدی کی مہیب اور مال دار طاقت نے مٹھی بھر ویتنامیوں سے شکست کھائی

یہ رہگزر۔۔۔ جس پر ان مہاجر، غریب، بے شہر و بے مکاں شیر دل فلسطینیوں کے خیمے لگے ہوئے ہیں

جو امن کی جنگ لڑ رہے ہیں، جو سر ہتھیلی پہ لے کر دنیا میں گھومتے ہیں...23؎

مذکورہ بالا نظم میں کربلا کے ایثار، سقراط کی حق گوئی، ویتنام کی جرات اور فلسطین کی مظلومیت کو ایک ہی فکری سلسلے میں پرویا گیا ہے۔ ظہور نظر اس عالمی جدوجہدِ حریت سے گہرا شخصی اور نظریاتی رشتہ استوار کرتے ہیں، جو ان کے فکری ثبات اور آفاقی انسانی درد کا بین ثبوت ہے:

مجھے اسی رہگزر پر چلنا ہے زندگی بھر

یہ زندگی چار دن ہو تو بھی

یہ زندگی سو برس ہو تو بھی۔24؎

عالمی حریت کے اس آفاقی تناظر کے ساتھ ساتھ ظہور نظر نے قومی تاریخ کے تلخ ترین سانحات اور داخلی خلفشار پر بھی گہرے دکھ اور فکر کا اظہار کیا ہے۔ اپریل 1971ء کے سیاسی اور قومی بحران (سقوطِ مشرقی پاکستان) کے پس منظر میں لکھی گئی ان کی نظم "پاگل پن" داخلی تصادم اور خود کش رویوں کا ایک باضمیر مرثیہ بن جاتی ہے:

میرا دایاں ہاتھ، بائیں ہاتھ کو

کاٹنے میں رات دن مصروف ہے

صحن سے دہلیز تک

خون کے دھبوں کی شطرنج بچھی ہے25؎

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

شاعر نے الم ناک حقیقت کو علامتوں کے ذریعے بے نقاب کیا ہے کہ جب کسی قوم کے داخلی حصوں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے، تو اس کا نتیجہ خود سوز تباہی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کا اختتام ایک بھیانک اور عبرت ناک انجام کی نشاندہی کرتا ہے:

آسمان پر دائرہ در دائرہ
چیختی چیلوں کا غول
منتظر ہے میرے بائیں ہاتھ کا
اور بایاں ہاتھ کٹ گرنے کو ہے26؎

تاہم، ان الم ناک سانحات اور گہرے زخموں کے باوجود، ظہور نظر کی حب الوطنی نعرے بازی سے پاک، وجودی اور تہذیبی رشتے میں ڈھل جاتی ہے۔ ان کی نظم "خاک کی داشتہ زمیں" ارضی شناخت اور وطن سے محبت کی ایک انوکھی اور شائستہ تعبیر پیش کرتی ہے:

ہوا ہے اور نہ ہو گا مجھے یہ مہرباں
کہ اُس کی داشتہ زمیں
ہے میری ماں!!27؎

اسی طرح نظم "وطن کا گیت" میں وہ اپنی ذات اور مٹی کی پہچان کو یکجا کر کے، اپنی شناخت کو وطن کے نام سے موسوم کرتے نظر آتے ہیں:

میرے اچھے وطن، میرے پیارے وطن
تو ہی میرا لہو، تو ہی میرا بدن
میرا عنوان تو، میری پہچان تو
تو ہی میری خبر، تو ہی میرا پتا28؎

وطن سے یہ والہانہ وابستگی صرف زبانی دعوے تک محدود نہیں، بلکہ شاعر اسے عمل، محنت اور عملی ایثار و قربانی سے جوڑتا ہے۔ وہ مٹی کی حرمت اور اس کی گلیوں کی تابانی کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی دریغ نہ کرنے کا عزم ظاہر کرتا ہے:

اپنے سینے کے بھی، تیری دھرتی کے بھی
زخم جہد و عمل سے سیئے جاؤں گا
تیری گلیوں میں بھی، تیری سرحد پہ بھی
روشنی کے لیے خوں دیئے جاؤں گا 29؎

یہاں سے ظہور نظر کی شاعری سیاسی و سماجی میدان سے نکل کر علم، کتاب اور تہذیبی ورثے کے فروغ کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ وہ کتابوں کو انسانی تہذیب کی یادداشت، ارتقا اور روشن مستقبل کا سب سے بڑا مرکز قرار دیتے ہیں:

اسے کتابوں میں دیکھا تو ایک ایک شہر تھا وہ
کہ تہذیب و ہنر کے تاج محل
قدم قدم پر جہاں دعوتِ نظارہ دیں
قدم قدم پر جہاں جہد و عزم کے مینار
سنبھلتی گرتی ہوئی خلق کو سہارا دیں

قدم قدم پر ہیں معبد جہاں محبت کے 30؎

یہ اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے ہاں ادب اور فکری سرمائے کی اصل افادیت انسان کو اخلاقی رہنمائی، تمدنی شعور اور آفاقی انسان دوستی کی طرف گامزن کرنے میں پنہاں ہے۔

ظہور نظر کے اس وسیع فکری کینوس، موضوعاتی تنوع اور عالمی انسانی تناظر کی تفہیم پر معتبر نقاد نوشی گیلانی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں کہ انھوں نے انسانی مسائل کو کسی خاص علاقے تک محدود رکھنے کے بجائے بین الاقوامی سطح پر محسوس کیا اور اسے اپنی نظموں کا روپ دیا:

> "ظہور نظر نے انسانی مسائل کو مقامیت کی سطح پر آ کر نہیں دیکھا بلکہ عالمی انسانی برادری کے ایک فعال اور باشعور رکن کی حیثیت سے محسوس کیا اور پھر اس پورے دکھ کو سچائی کے ساتھ نظم کیا۔۔۔ ظہور نظر کے مقام تک پہنچنے کے لیے ہمیں ظہور نظر کے راستوں کے دکھوں کو دیکھنا ہو گا۔ اس کی زندگی کے پورے کرب کو محسوس کرنا ہو گا، تب کہیں جا کر ہم ظہور نظر کے شعری سفر کے یقین کا پتہ لگا سکیں گے۔"31؎

ان کی اخلاقی اور نظریاتی استقامت پر بات کرتے ہوئے نوشی گیلانی مزید رقم طراز ہیں کہ ظہور نظر کا پورا شعری اور عملی کردار مزاحمت سے عبارت تھا:

> "ہمارے ہاں ترقی پسند تحریک کو بدنام کرنے کی بہت کوشش کی گئی... مگر ظہور نظر کھرا اور سچا ترقی پسند تھا۔ اس کا پورے کا پورا کردار مزاحمتی تھا... وہ گہری راتوں کی زنجیروں میں قید صبحوں کو واگزار کرانے کے لیے غیر منصف سورجوں کے خلاف نبرد آزما بھی رہا اور جبر کے موسموں میں صبر کی تلقین کرنے والوں کے اصل چہرے بھی دکھاتا رہا ہے۔"32؎

مختصراً یہ کہ ظہور نظر کی نظم نگاری اردو شاعری کی ترقی پسند اور انسان دوست روایت میں ایک روشن باب کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کا موضوعاتی تنوع عالمی انسانی جدوجہد، قومی سانحات کی دردمندانہ عکاسی، ارضی جذبوں کی سچائی، اور تہذیبی آگاہی کے حسین امتزاج پر مبنی ہے۔ وہ محض نعرے بازی اور عارضی جذباتیت سے بلند ہو کر ایک باضمیر، صاحبِ طرز اور استقامت سے بھرپور شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جن کا فکر و فن اور روشن مستقبل کا ایقان ان کی تخلیقات کو اردو ادب میں ایک سدا بہار اور منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

فیض احمد فیض:

فیض احمد فیض کی نظم نگاری میں موضوعاتی تنوع اور فکری وسعت اردو ادب کا ایک درخشان باب ہے۔ انہوں نے روایتی غنائی عناصر کو اجتماعی انسانی دکھ، سیاسی جدوجہد اور بین الاقوامی فکر سے جوڑ کر نظم کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ ان کی شاعرانہ فکر صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں، بلکہ اس میں انسانی حقوق، آزادی اور سیاسی بصیرت کا گہرا امتزاج ملتا ہے۔

فیض کی شاعری میں فکر و عمل کا وہ وسیع تناظر پایا جاتا ہے جو کسی ایک نظریے میں محصور رہنے کے بجائے عالمی انسانیت کی بھلائی پر محیط ہے۔ ان کی اس ہمہ گیر شخصیت اور عالمی اثر پذیری پر روشنی ڈالتے ہوئے قمر رئیس رقم طراز ہیں:

> "فیض ہمارے ان شعرا میں ہیں جو اپنی زندگی ہی میں ایک Myth بن گئے۔ یوں تو ان کی کئی حیثیتیں ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے اولین معماروں میں ان کا نام ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ پاکستان میں ڈاک، تار اور ریلوے کی ٹریڈ یونین تنظیموں کے بھی سربراہ رہے ہیں۔ صحافت اور تعلیم سے بھی ان کا گہرا تعلق رہا

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ہے، پھر عالمی امن تحریک اور افروایشیائی ادیبوں کی تحریک میں بھی انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس طرح نہ صرف برصغیر بلکہ ساری دنیا کے امن دوست اور محنت کش انسانوں کی زندگی اور ایک بہتر مستقبل کے لیے ان کی جدوجہد سے ان کا رشتہ استوار رہا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کروڑوں انسان، فلسطینی مجاہدین اور خود برصغیر کے عوام ظلم و تشدد اور استحصال کے شکنجے سے آزادی کے لیے جو مقدس جدوجہد کر رہے ہیں اور جو قربانیاں دے رہے ہیں، اس کا رزمیہ آہنگ فیض کی شاعری کے رجائی اور غنائی لب و لہجے میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔"33؎

اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فیض نے عالمی سطح پر استبداد سے نبرد آزما طبقات کو اپنی آفاقی بصیرت کے ذریعے زبان بخشی، جس سے ان کی نظم نگاری محض مقامی یا وقتی بیانیے کے بجائے بین الاقوامی ضمیر کی آواز بن کر ابھری۔

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں فیض کی حیثیت ایک ایسے موڑ کی ہے جہاں سے آگے کا راستہ ان کے قائم کردہ اسلوب سے مستعار نظر آتا ہے۔ ان کے اسی منفرد شعری درجے کا احاطہ کرتے ہوئے احسن کمال لکھتے ہیں:

"اپنے عہد پر نظر ڈالتا ہوں تو دو تین ایسے شاعر نظر آتے ہیں، جن سے نہ صرف اردو کی محفل میں آب و تاب ہے بلکہ جن کی شاعری دنیا کی بڑی شاعری سے آنکھیں چار کر رہی ہے۔ ان دو تین شعرا میں فیض کا نام بھی ہے۔ میرے خیال میں ایسی شامیں بہت کم ہیں جب شاعری، شاعر اور اس کی ذاتی زندگی اس طرح گھل مل گئی ہو کہ دونوں کو ہرگز الگ نہ کیا جا سکے۔ آزادی کے بعد اردو کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے فیض کا اثر نہ قبول کیا ہو۔"34؎

یہ مطالعہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ فیض کا تخلیقی اثر معاصر ادب پر بے حد گہرا اور دیرپا رہا، جس کے باعث ان کے بعد آنے والی نظم نگاری کا کوئی بھی سنجیدہ دھارا ان کے نقشِ قدم سے مستغنی نہیں ہو سکا۔

فیض کے ہاں محبت اور حیات کا تصور معروضی تلخیوں کے باوجود نفی کے بجائے اثبات پر مبنی ہے۔ وہ ذات کے نہاں خانوں سے نکل کر حبِ وطن اور حق کی پاسداری کا عہد یوں باندھتے ہیں:

عشق کا سِر نہاں، جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے 35؎

ان اشعار میں شاعر نے داخلی اضطراب کو اجتماعی صداقت کے اظہار سے منسوب کیا ہے، جہاں حرفِ حق کی ادائیگی ہی ضمیر کے باطنی اطمینان کا واحد وسیلہ بن کر ابھرتی ہے۔

ان کی نظموں میں جمالیاتی احساس فطرت اور انسانی رویوں سے مربوط ہو کر زندگی کو ایک تعمیری روشنی اور تازگی فراہم کرتا ہے:

برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں
صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں۔۔۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

اس پیار میں کوئی دھوکا ہے،
تو نار نہیں کچھ اور ہے، ورنہ کیوں شے ہر ایک سے
میں تیرے سپنے دیکھوں۔36؎

فطرت کے یہ رنگین مظاہر اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ فیض کے ہاں داخلی کیفیات کا پھیلاؤ خارجی آفاق تک محیط ہے، جس میں محبوب کا وجود تمام تر کاست و نقص کا ازالہ بن جاتا ہے۔

حسن و جمال کا یہ مثبت تصور کٹھن سیاسی یا تہذیبی ادوار میں امید اور حوصلے کا سائبان بن کر ابھرتا ہے:

تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک،
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن۔37؎

شاعر نے معشوقانہ رعنائی اور وطنی نسبت کو ایک ہی لڑی میں پرو کر یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ حسن کی موجودگی انسانی دلوں میں بقا کا اعتماد پیدا کرتی ہے۔

تاہم قیامِ پاکستان کے بعد جب سیاسی ناانصافی اور عوامی توقعات کی شکست کا دور شروع ہوا، تو فیض نے آزادی کے اس ناقص روپ کو بغیر کسی مصلحت کے بے نقاب کیا:

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں 38؎

شاعر کا یہ تاثر تاریخی موڑ کی اس تلخ حقیقت کو گرفت میں لیتا ہے جہاں برسوں کے سیاسی خواب بظاہر تعبیر پا کر بھی عوامی زندگی میں سچی شادمانی اور عدل نہ لا سکے۔

حالات کے اس بگاڑ کے باوجود فیض کے دل سے لیلائے وطن کی محبت کا جذبہ کمزور نہیں پڑتا، بلکہ وہ اس رشتے کو مزید استوار کرتے ہیں:

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں 39؎

شاعر کا یہ پختہ عزم ظاہر کرتا ہے کہ حالات کی نامساعدت اور ستم ظریفی کے باوجود ان کی سرزمیں سے وابستگی ایک ابدی اور غیر متزلزل سچائی پر مبنی ہے۔

حوادثِ زمانہ کی شدت اور وطنی ابتری کے باوجود فیض کا لب و لہجہ مایوسی پر فتح پاتا ہوا مستقبل کی بشارت دیتا ہے:

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے،
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں۔40؎

یہ تحریر ثابت کرتی ہے کہ ظلم کا ہر دور فیض کے ہاں وقتی تاریکی کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی کوکھ سے صبحِ نو کی کرن کا پھوٹنا ایک مسلّمہ امر ہے۔

وطن کے زخمی اور تار تار وجود کو دیکھ کر بھی شاعر کا لہجہ شکوے کے بجائے ایثار اور محبت کے والہانہ جذبے کا مظہر بنتا ہے:

مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر 41؎

وطن کے زخموں سے یہ دردمندانہ لگاؤ ثابت کرتا ہے کہ فیض کی وطن دوستی محض سیاسی نعرہ نہیں، بلکہ ان کی شعری و روحی ترجیحات کا لازمی جزو ہے۔

جبر اور آمریت کے دور میں جب سچائی کے راستے پر چلنا محال بنا دیا گیا، تو فیض نے استبدادی نظام کی ستم ظریفی کو اپنی نظم میں یوں نقش کیا:

چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے،
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے،

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے۔42؎

ان سطروں میں آمرانہ دور کے خوف اور دم گھٹتے ماحول کی ایسی پاسداری کی گئی ہے جو مظلوم انسان کی سلب شدہ آزادیِ اظہار پر ایک الم ناک تبصرہ ہے۔ اس ستم کے مقابلے میں فیض حق اور وفا کے طلب گاروں کو سر تسلیم خم کرنے کے بجائے میدانِ عمل میں نکلنے کی شہ دیتے ہیں:

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہر جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو۔43؎

یہ دعوتِ عمل اس بات کا اعادہ کرتی ہے کہ آزادی اور انسانی وقار کے تحفظ کی خاطر اہلِ دل کو ہر بلا اور آزمائش سے گزرنے کے لیے آمادہ رہنا چاہیے۔ قید و بند کی تاریک فضاؤں میں بھی ان کی نظر سے امید کے روشن چراغ اوجھل نہیں ہوتے اور وہ رہائی کی خوشخبری یوں سناتے ہیں:

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ، سحر آئی ہے، جاگ44؎

یہ اندازِ فکر اس وجودی اور انقلابی سچائی کو منور کرتا ہے کہ قید کی دیواریں جسمانی وجود کو تو پابند کر سکتی ہیں، لیکن حق اور سحر کی آمد کی امید کو شکست نہیں دے سکتیں۔ اسی استقامت کے باعث زندان کی تلخی ان کے ہاں تسلط کے عارضی پن کے ایقان میں بدل جاتی ہے:

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل۔45؎

یہ مختصر پیغام اس حتمی سچائی پر دلالت کرتا ہے کہ ستم گروں کا اقتدار وقت کی دھول میں مٹ جانے والی ایک عارضی کیفیت کے سوا کچھ نہیں۔ فیض ظلم کے جبر کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے عوام کو اپنے حقوق کی سرفرازی کے لیے سرِ عام نکلنے کا حوصلہ بخشتے ہیں:

آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو 46؎

زنجیروں میں جکڑے قدموں کے ساتھ یہ پُر وقار پیش قدمی یہ بتاتی ہے کہ استبداد کے خلاف احتجاج جب جمالیاتی رقص اور استقامت کا روپ دھار لے تو وہ حاکمِ وقت کے جاہ و جلال کو ہیبت زدہ کر دیتا ہے۔ فیض کے اس طرزِ بیان میں داخل اور خارج کا ایک ایسا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے جو ہنگامی واقعات کو آفاقی صداقتوں میں بدل دیتا ہے۔ اس فکری سفر کی تحویل کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید یوں رقم طراز ہیں:

"فیض نے بہت سے ہنگامی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں اور جب موضوع ان کے داخل سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو کائنات کا غم ایک مثبت کردار کی طرح پوری نظم میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور قاری اس ہنگامے کی معنویت سے گہرا تاثر قبول کرتا ہے۔"47؎

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

یہ تنقیدی جائزہ اس نکتہ کی توثیق کرتا ہے کہ فیض کا کمال ان کے خارجی مسائل کو ذات کی روح میں رچا لینا ہے، جس سے وقتی سیاق و سباق بھی ادبی اور کائناتی معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ تاریخ کے ان گمنام شہدا اور مظلوموں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں جن کا خون طاقت کے ایوانوں کی نذر ہو گیا:

ع یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا۔48

یہ مصرع سماجی بے حسی پر گہری چوٹ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ نظام کی ریاکاری کس طرح عام انسانوں کی قربانیوں کو فراموش کر دیتی ہے۔ عدل و انصاف کے اداریاتی بحران اور حاکموں کی لاقانونیت پر فیض کا سیاسی شعور نہایت تیز اور تیکھا ہو جاتا ہے:

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اُس کی ہے، میزاں بہ دستِ دگراں ہے49

یہ شعر معاشرتی ڈھانچے کی اس زبوں حالی کی عکاسی کرتا ہے جہاں انصاف کے نام پر انصاف ہی کو زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو۔ جب خارجی جبر داخلی وجود پر اثر انداز ہوتا ہے، تو فیض اس اذیت کو ایک بلاواسطہ اور عمیق وجودی کرب کی صورت میں رقم کرتے ہیں:

درد اتنا تھا کہ اس رات دلِ وحشی نے
بزرگ جاں سے الجھنا چاہا،
ہر رگِ مو سے ٹپکنا چاہا50

یہ کیفیت اس امر کو اجاگر کرتی ہے کہ شاعر کا حسیاتی نظام جبر و تشدد کی ہولناکی سے کتنا گہرا صدمہ محسوس کرتا ہے، تاہم یہ درد باطنی توانائی کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ حالات کے اس بھیانک موڑ پر بھی فیض کا بیانیہ انسان کو خوف سے آزاد ہو کر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرتا ہے:

تم خوف و خطر سے درگزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہو گا دیکھا جائے گا51

سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا52

ان بیانات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ فیض کا فلسفۂ حیات بے جا اندیشوں سے آزادی اور مسلسل جدوجہد پر قائم ہے۔ انقلابی بصیرت کو تاریخی حوالے سے استوار کرنے کے لیے فیض نے واقعہ کربلا کو ایک آفاقی اور پائیدار استعارے کے طور پر برتا ہے:

رات آئی ہے شبیرؓ پہ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غم خوار رہا ہے
مونس ہے تو اِک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

یہ خانۂ شبیر کی ویرانی کی شب ہے 53؎

یہ تاریخی تمثیل مظلومیت اور تنہائی کو عظمت اور استقامت کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچا دیتی ہے، جو ہر دور کے ستم رسیدہ انسان کے لیے حوصلے کا استعارہ ہے۔ ظلم اور استبداد کی حتمی شکست اور عوامی حاکمیت کے اس محکم ایقان کا اظہار ان کی نظم "ہم دیکھیں گے" کے ان اشعار میں ہوتا ہے:

لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جن کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے 54؎
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو 55؎

ان انقلابی مصرعوں میں تاریخی جبر کی تباہی اور محکوم طبقات کی فتح کا جو عزم موجود ہے، وہ فیض کو عوامی امید کا سب سے بڑا نقیب بناتا ہے۔ فیض نے ان تمام سیاسی اور سماجی معرکوں کو جس نرم، غنائی اور دل نشین انداز میں پیش کیا، اس نے ان کے اسلوب کو ایک منفرد تہذیبی حظ عطا کیا۔ ان کے اس سحر انگیز اور دلکش لب و لہجے کو سراہتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"فیض احمد فیض نے اپنے عصر کی اتنی بلیغ اور جمیل ترجمانی کی ہے کہ ان کی ذات اپنی زندگی ہی میں ایک تحریک اور ایک اسلوب کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ ان کے بعد آنے والے کتنے بے شمار شعرا ایسے ہیں جن کے ہاں فیض کے محبوب لہجے اور ان کی مخصوص لفظیات کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ اقبال، جوش اور فراق کے بعد فیض سے زیادہ شاید ہی کسی شاعر نے اپنے معاصرین کو اتنی شدت اور کثرت سے متاثر کیا ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ فیض انسانی معاشرے میں ایک مثبت انقلاب کے داعی ہیں، مگر ان کے ہاں انقلابیوں کی سی گھن گرج کی بجائے ایک نغماتی سرگوشی کا سا انداز ہے۔" 56؎

احمد ندیم قاسمی کا یہ جائزہ واضح کرتا ہے کہ فیض نے انقلابی اور مزاحمتی افکار کو درشتی اور خطابت سے بچا کر غنائیت اور لطافت کے ایسے سانچے میں ڈھالا جو قارئین کے دلوں پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے فن کی یہی نزاکت اور موضوعاتی توازن ان کی نظموں کو وقت کی قید سے آزاد کر کے ابدیت عطا کرتا ہے۔ اس فنی و فکری امتزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ جعفر یوں تبصرہ کرتی ہیں:

"فیض کی اصل شاعری کا وصف وہاں نظر آتا ہے جہاں موضوعاتی شاعری کی ہنگامہ آرائی اور گرمی نے فن کی لطافتوں پر آنچ نہیں آنے دی ہے۔ فیض کے ہم مشرب شعرا کی نظموں میں مستقبل کے خواب، نئے افق کی تلاش۔۔۔ بار بار سامنے آتے ہیں، لیکن ان کی بعض نظموں نے اس لیے اپنی آب و تاب کھو دی کہ ان میں سیاسی واقعات پر فن کو بھینٹ چڑھا دیا گیا اور ادبی لطافتیں اکہرے لب و لہجے، مصروفیت اور بے رنگ خطابت کی نذر ہو گئیں۔" 57؎

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا یہ محاکمہ ثابت کرتا ہے کہ فیض نے سیاسی مسائل اور سماجی تحریکوں کو شاعری میں برتتے ہوئے ادبی جمالیات اور فن کے اعلیٰ معائیر پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یہی فکری بیداری اور فنکارانہ توازن ان کی نظم نگاری کو اردو ادب کے جریدے پر ایک لازوال حیثیت فراہم کرتا ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

حبیب جالب:

حبیب جالب جدید اردو نظم کے ان نمائندہ اور عہد ساز شعرا میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے شاعری کو محض جمالیاتی اظہار، شخصی جذبات کی ترجمانی یا فرد کے داخلی دکھ درد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کی بااثر ترجمان بنادیا۔ ان کی نظم نگاری میں عوامی بیداری، جمہوری شعور، آمریت کے خلاف مزاحمت، طبقاتی استحصال پر احتجاج، عالمی انسان دوستی، نسائی احساس اور آزادیِ فکر جیسے متنوع موضوعات نہایت فکری گہرائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی موضوعاتی وسعت اور نظریاتی پختگی انہیں اردو کی مزاحمتی اور عوامی شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ جالب نے اردو نظم کے موضوعاتی افق کو ایوانوں اور خواص کی بند محفلوں سے نکال کر گلی کوچوں، عوامی اجتماعات اور مظلوم طبقے کے مسائل سے جوڑ دیا۔

> "حبیب جالب جمہوریت کے حق اور آمریت کے خلاف مزاحمت کی توانا آواز تھے۔ ان کی شاعری کو حکمران طبقہ خطرناک تصور کرتا تھا، جس کے باعث انہیں پابندیوں اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں، تاہم وہ عوامی حقوق اور جمہوری اقدار کے لیے اپنی جدوجہد سے دست بردار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام میں غیر معمولی مقبول تھے اور دانش وروں کے ساتھ ساتھ مزدوروں، کسانوں اور عام لوگوں میں بھی ان کے کلام کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کی عوامی مقبولیت کے پیش نظر متعدد ناقدین نے انہیں نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو کا بڑا عوامی شاعر اور مزاحمت و احتجاج کی بلند آواز قرار دیا ہے۔"58

نند کشور وکرم کے اس تبصرے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جالب کی نظم نگاری میں بنیادی اہمیت عوامی سچائیوں اور سیاسی موضوعات کو حاصل ہے۔ حکمران طبقے کا عتاب اور قید و بند کی صعوبتیں بھی ان کے عزم کو متزلزل نہ کر سکیں، اور ان کی اسی بے باک عوامی وابستگی نے ان کے موضوعاتی دائرے کو وسعت دے کر انہیں اردو ادب میں نظیر اکبر آبادی کی روایت کا سچا وارث بنادیا۔

حبیب جالب کی شاعری محض ایک جزوی یا مقامی احتجاج نہیں تھی بلکہ اس کے پسِ منظر میں ایک باقاعدہ فکری، معاشی اور طبقاتی تصور کار فرما تھا۔ ان کی شعری شناخت اور موضوعاتی تنوع کی بنیادی وجہ ان کا وہ انقلابی اور نظریاتی موقف تھا جس سے انہوں نے عمر بھر انحراف نہیں کیا۔ اس نظریاتی اساس کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں:

> "حبیب جالب نظریے کا شاعر ہے۔ اس لیے کہ وہ نظریے کا انسان ہے۔ زندگی کی قدریں اسے بے حد عزیز ہیں۔ وہ بے قاعدگی، ظلم، ناانسانی، تعیش پسندی، اخلاقی پستی، سماجی ناہمواری کا دشمن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں ہر اس شخص کے ساتھ ہو جاتا ہے جو ان قدروں کو ساتھ لے کر لاتا ہے۔ لیکن جہاں ان قدروں سے اس کا دامن چھوٹتا ہے، حبیب جالب اس سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے اور اپنے فکر و فن کے نشتر سے اس کو ادھیڑ دیتا ہے۔"59

عبادت بریلوی کی اس رائے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ جالب کے ہاں نظریہ کوئی جامد یا مجرد فکری مشق نہیں تھا، بلکہ وہ عملی زندگی اور عصرِ حاضر کی تلخ حقیقتوں سے گہرا تعلق رکھتا تھا۔ ان کی اسی نظریاتی پختگی نے ان کی نظموں میں مسلسل جدوجہد اور استقامت کا موضوع شامل کیا، جس کے باعث ان کا کلام کسی ایک سیاسی حادثے تک محدود رہنے کے بجائے ہر دور کے ظلم اور استبداد کے خلاف ایک ہمہ گیر موضوعاتی استعارہ بن گیا۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جالب کا یہ نظریاتی ایقان صرف سیاسی تحرک تک محدود نہیں رہا بلکہ انہوں نے اسے عظیم شعری و فکری روایت کا تسلسل قرار دیا۔ وہ اپنی مزاحمتی فکر کو اقبال کے پیغامِ بیداری اور محروم طبقے کی زبوں حالی کے سدھار سے مربوط کرتے تھے۔ اس فکری تسلسل اور اپنے عملی کردار کی وضاحت جالب نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "علامہ مرحوم میری ڈیوٹی لگا گئے تھے کہ 'اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'، میں اس ڈیوٹی کو بھگتانے کے سلسلے میں پندرہ بار جیل جا چکا ہوں۔"60

اس اعتراف سے ظاہر ہوتا ہے کہ جالب نے اقبال کے انقلابی اور بیداری کے پیغام کو محض لفظی احترام نہیں دیا بلکہ اسے اپنے دور کے سیاسی حالات سے جوڑ کر عملی جدوجہد اور عوامی بیداری کا بنیادی موضوع بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظمیں عوامی بیداری اور اجتماعی شعور کا دھڑکتا ہوا دل بن گئیں۔

جالب کی نظم نگاری کا ایک اور نمایاں اور محاذ آرائی سے بھرپور موضوع ایوب خان کے دورِ حکومت کے غیر جمہوری رویوں اور صدارتی آئین کی مخالفت تھی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا اور ۱۹۶۲ء کے غیر جمہوری دستور نے عوام کے سیاسی حقوق سلب کر لیے تھے، جس پر جالب نے اپنی نظموں کے ذریعے آواز بلند کی۔ ان کی مشہور نظم "دستور" اس دور کی تلخ سیاسی صورتِ حال کا بہترین مرقع ہے:

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبحِ بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا۔61

یہ اشعار اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جالب نے حکمران طبقے کی جانب سے مسلط کردہ فردِ واحد کے سیاہ و سفید کو ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ نظم "دستور" نے اپنے وقت کے جبر اور غیر جمہوری آئین کو اپنا موضوع بنایا اور ثابت کیا کہ جالب کا قلم جمہوریت کے حق میں ایک ناقابلِ تسخیر آواز ہے۔

مستبدانہ قوانین اور فردِ واحد کے اقتدار کی مخالفت کے ساتھ ساتھ جالب نے بیرونی طاقتوں پر سیاسی و معاشی انحصار، اور عوام کے حقوق کی پامالی کو بھی اپنی نظموں کا شدید موضوع بنایا۔ وہ قومی خودداری اور جمہوریت کے تسلسل کو ملک کی بقا کا ضامن سمجھتے تھے:

امریکہ سے مانگ نہ بھیک،
مت کر لوگوں کی تضحیک
روک نہ جمہوری تحریک،
چھوڑ نہ آزادی کی راہ
پاکستان کا مطلب کیا،
لا الٰہ الا اللہ۔62

ان سطور کے ذریعے شاعر نے اس تلخ حقیقت کو بے نقاب کیا کہ جو حکمران بیرونی طاقتوں کی مدد سے اقتدار پر قابض رہتے ہیں، وہ دراصل اپنے ہی عوام کو جمہوریت اور آزادی کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ جالب نے تحریکِ پاکستان کے بنیادی نعرے کو ایک نئے جمہوری اور مساواتی سیاق میں پیش کر کے عوامی جدوجہد کو اپنی نظموں کا مرکزی موضوع بنایا۔

سیاسی مزاحمت کے شانہ بشانہ حبیب جالب کی شاعری کا ایک انتہائی اہم موضوع طبقاتی کشمکش اور سرمائے کے مرکز اور مرتکز ہونے پر احتجاج ہے۔ جالب نے اپنے کلام میں واضح کیا کہ ملک کو اصل خطرہ بیرونی دشمنوں سے زیادہ ان اندرونی استحصالی طبقات سے ہے

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جو قائدین کے روپ میں عوام کو لوٹتے ہیں:

وطن کو کچھ نہیں خطرہ، نظامِ زر ہے خطرے میں
حقیقت میں جو رہزن ہے، وہی رہبر ہے خطرے میں۔63

یہ بیت اس طبقاتی تضاد کو نہایت عمدگی سے طشت از بام میان کرتی ہے۔ شاعر نے اس سوچ کو رد کیا کہ معاشی ناہمواری محض ایک اتفاقی امر ہے، بلکہ انہوں نے اسے نظامِ زر کا شاخسانہ قرار دیا اور معاشی ناانصافی کو اپنی نظم نگاری کا کلیدی موضوع بنایا۔

جالب اس استحصالی نظام اور عوامی بے حسی کو توڑنے کے لیے عوام کو ان کی عددی اور سیاسی طاقت کا احساس دلاتے ہیں۔ وہ عوام کے جمود پر چوٹ کرتے ہوئے انہیں ان کے حقوق کی بازیافت پر اکساتے ہیں:

دس کروڑ انسانو!
زندگی سے بیگانو!
صرف چند لوگوں نے
حق تمہارا چھینا ہے
خاک ایسے جینے پر
یہ بھی کوئی جینا ہے۔64

اس بند کا بنیادی موضوع غریب اور محنت کش عوام کی بیداری ہے۔ جالب کا مقصد عوام میں یہ فکری تبدیلی لانا تھی کہ اقلیت پر مشتمل استحصالی طبقہ اسی وقت تک ان پر مسلط رہ سکتا ہے جب تک اکثریت اپنے حقوق سے غافل اور مجہول رہے گی۔

آزادیِ اظہار اور فکری خود مختاری جالب کی نظموں کے وہ بنیادی موضوعات ہیں جن پر انہوں نے قید و بند کی سزاؤں کے باوجود کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ انہوں نے عوامی سطح پر خود اعتمادی پیدا کرنے اور موروثی و جاگیر دارانہ قیادت کا بت توڑنے کے لیے مسلسل نظمیں لکھیں:

گیا زمانہ سرداروں کا، اپنی بات کرو
چھوڑو قصۂ زرداروں کا، اپنی بات کرو۔65

یہ مصرعے عوام کو یہ درس دیتے ہیں کہ وہ جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر جینے کے بجائے اپنی زبان اور اپنے مسائل کو خود اظہار کا ذریعہ بنائیں۔ جالب کی نظر میں نظم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ عام فرد کو اپنی رائے اور حقوق کی بیداری کا شعور میسر آئے۔

حبیب جالب کی نظم نگاری میں انقلابی جدوجہد کوئی عارضی یا وقتی ابال نہیں تھی، بلکہ یہ ایک طویل اور مستحکم نظریاتی سفر تھا جس کا موضوع مسلسل مزاحمت تھا۔ وہ جب تک معاشرے میں ظلم اور ناانصافی موجود دیکھتے، جدوجہد کو اپنی نظموں کا مرکز بنانے کے قائل تھے:

ظلم کہیں بھی ہو ہم اس کا سر قلم کرتے جائیں گے
محلوں میں اب اپنے لہو کے دیئے نہ جلنے پائیں گے
کٹیاؤں سے جب تک صبحوں نے منہ پھیرے ہیں
اپنی جنگ رہے گی۔66

ان اشعار میں "محل" اور "کٹیا" کے استعاروں کے ذریعے سماجی تفاوت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جالب کی نظموں کا یہ موضوعاتی پہلو باور کراتا ہے کہ جب تک محنت کشوں کے جھونپڑوں تک خوشحالی اور روشنی نہیں پہنچتی، ظلم و ناانصافی کے خلاف جدوجہد کا موضوع زندہ رہے گا۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

پاسبانانِ اقتدار اکثر اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے مذہب کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن جالب نے اس سیاسی منافقت اور مذہب کے سیاسی استعمال کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا:

خطرہ ہے بٹ ماروں کو
مغرب کے بازاروں کو
چوروں کو، مکاروں کو
خطرے میں اسلام نہیں۔66

اس نظم کے ذریعے جالب نے اس باطل بیانیے کو موضوعِ بحث بنایا جو ہر جمہوری اور سماجی مطالبے کو مذہب کے لیے خطرہ قرار دے کر دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ اسلام کو نہیں بلکہ استحصالی طبقات کے ناجائز مفادات کو عوام کی بیداری سے خطرہ ہوتا ہے۔

جالب کا کلام صرف اجتماعی اور سیاسی موضوعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس میں ان کا شخصی کرب اور خاندانی دکھ بھی گھل مل کر ایک وسیع تر سماجی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ جب آمرانہ جبر کے باعث انہیں بار بار جیل بھیجا جاتا تھا، تو اس کا عکس ان کی نجی اور خاندانی زندگی پر پڑتا جسے انہوں نے یوں نظم کیا:

مجھ سے میری ننھی بچی
ابو گھر چل، ابو گھر چل
کیسے بچی کو سمجھاؤں
گھر بھی تو زنداں کی طرح ہے۔67

یہ الم ناک بند ایک باپ کے ذاتی دکھ اور پوری ریاست میں پھیلی ہوئی گھٹن و بے آزادی کے موضوع کا خوبصورت امتزاج ہے۔ گھر کو زنداں سے تشبیہ دے کر جالب نے ثابت کیا کہ جہاں آزادی اور عدل کا وجود نہ ہو، وہاں پورا ملک قید خانے کا روپ دھار لیتا ہے۔

مقامیت اور قومی مسائل سے آگے بڑھ کر حبیب جالب کی فکر کا ایک رخ عالمی امن، انسان دوستی اور بین الاقوامیت کے موضوعات کی طرف بھی مائل ہوتا ہے۔ وہ جنگ کی تباہ کاریوں کے خلاف اور خلقِ خدا کی بہبود اور پر امن بقائے باہمی کے زبردست حامی تھے:

پاک روس دوستی، زندگی زندگی
پاک روس دوستی، روشنی روشنی
چھٹیں گے جانِ جنگ سے
بچیں گے بھوک ننگ سے
کھلے گا چہرۂ وطن محبتوں کے رنگ سے۔68

اس نظم میں جالب نے بین الاقوامی تعلقات اور عالمی امن کو غریب عوام کی معاشی بہتری اور جنگی ہوس کے خاتمے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک عالمی امن قائم ہوئے بغیر بھوک، افلاس اور بیماری جیسے بنیادی مسائل پر قابو پانا ممکن نہیں۔

حبیب جالب کی نظموں کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ان کی شاعری کسی ایک فکری خانے یا ایک محدود موضوع تک محصور نہیں، بلکہ وہ اپنے دور کے سماجی و سیاسی تضادات، عوامی تحریکوں، طبقاتی کشمکش، بین الاقوامی امن اور فرد کی داخلی کیفیات کا ایک ہمہ گیر مرقع ہے۔ جالب نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو وسعت دے کر اسے ظلم، ناانصافی اور آمریت کے خلاف ایک توانا اور آفاقی آواز بنا دیا، جو آج بھی مزاحمت اور آزادیِ فکر کا سچا استعارہ ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

منیر نیازی:

منیر نیازی کی نظموں کا موضوعاتی مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ ان کی شعری کائنات کا سرچشمہ خارجی واقعہ نگاری سے زیادہ داخلی تجربہ، نفسیاتی واردات اور انسانی احساسات کی پیچیدہ جہتیں ہیں۔ ان کی نظموں میں ذاتی تجربہ اس فنی سطح پر اظہار پاتا ہے کہ وہ انفرادی واردات سے بلند ہو کر اجتماعی انسانی تجربے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہی خصوصیت ان کے موضوعاتی تنوع کی اساس بنتی ہے۔ تنقیدی تناظر میں جب ہم منیر نیازی کے احساسات اور جذباتی سچائی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی شاعری کسی پرایکائی یا مصنوعی دنیا کی ترجمانی کے بجائے زندگی کی حقیقی لہروں کی عکاس ہے۔ مجید امجد نے منیر نیازی کی شاعری کے اسی امتیاز اور انسانی جذبے کے گریز پا پہلوؤں کے اظہار کی نشاندہی کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> "اس نے جو کچھ لکھا ہے جذبے کی صداقت کے ساتھ لکھا ہے، اور اس کے احساسات کسی عالمِ بالا کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس کی اپنی زندگی کی سطح پر کھیلنے والی لہریں ہیں۔ انہی نازک، چنچل، بے تاب، دھڑکتی ہوئی لہروں کو اس نے شعروں کی سطروں میں ڈھال دیا ہے اور اس کوشش میں اس نے انسانی جذبے کے ایسے گریز پا پہلوؤں کو بھی اپنے شعر کے جادو سے اجاگر کر دیا ہے جو اس سے پہلے اس طرح ادا نہیں ہوئے تھے۔ یہی منیر نیازی کا کمالِ فن ہے۔"69

مجید امجد کا یہ تجزیہ منیر نیازی کی نظموں کے موضوعاتی نظام کی تفہیم میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ منیر نیازی نے انسانی وجود کے ان لطیف اور متحرک احساسات کو موضوع بنایا جو عمومی شعری روایت میں کم توجہ کا مرکز رہے تھے۔ انہی احساسات اور وجودی تلاش کا سفر شاعر کو حقیقت کی جستجو، ماضی کی بازیافت اور باطنی کائنات سے وابستہ کرتا ہے۔ اس فکری وسعت اور باطنی کائنات کی اہمیت کی توثیق کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں کہ "بڑی شاعری آخری حقیقت تک جانے والی سمت کی نشان دہی ضرور کر دیتی ہے اور منیر نیازی کی شاعری اس کا ایک ثبوت ہے۔"70

احمد ندیم قاسمی کے اس ارشاد کی روشنی میں یہ نقطہ نمایاں ہوتا ہے کہ منیر نیازی کی شاعری محض سطحی حسیات کا بیان نہیں بلکہ گہری روحانی و فکری سچائیوں کا اعلانیہ ہے۔ قاسمی منیر نیازی کے اس باطنی اور خارجی ربط کو مزید واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "جس شاعر کے ہاں خارجی کائنات انسان کی باطنی کائنات کا ایک ناگزیر حصہ بن کر رہ گئی ہے، وہ اس دور میں منیر نیازی ہی ہے۔"71

ان آرا سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ منیر نیازی کی نظموں میں فطرت، انسانی باطن اور روحانی جستجو جیسے متنوع موضوعات ایک مربوط فکری نظام کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ موضوعاتی دائرہ محض انفرادی احساسات تک محدود نہیں بلکہ اس میں اپنے عہد کے سماجی اور تہذیبی مسائل بھی جمالیاتی پیرایے میں ابھرتے ہیں۔ تخلیق کار کے اس معاشرتی اور جمالیاتی رول پر روشنی ڈالتے ہوئے امجد طفیل کے نزدیک ان کی شاعری نعرے بازی کے بجائے خالص تخلیقی بنیادوں پر عصری منظر نامہ مرتب کرتی ہے:

> "منیر نیازی کی شاعری ہمارے عہد کا ایک ایسا منظر نامہ مرتب کرتی ہے جس میں ہم اپنے عہد کے فرد اور سماج کی چلتی پھرتی شکلیں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ منیر نیازی کوئی سماجی مفکر، سیاسی کارکن یا نعرے باز فرد نہیں، وہ اول و آخر ایک تخلیق کار ہے، جو تخلیق کی جمالیاتی قدروں کو فن میں اولیت دیتا ہے۔"72

اس تنقیدی محاکے سے ثابت ہوتا ہے کہ منیر نیازی کی شاعری کا بنیادی حوالہ جمالیاتی ہے اور وہ نعرے بازی سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے عہد کا سیاسی و سماجی منظر نامہ مرتب کرتے ہیں۔ اسی نقطے کو آگے بڑھاتے ہوئے اور ان کی فکر کو کسی بھی سیاسی یا نظریاتی خانے سے بالاتر قرار دیتے ہوئے اشفاق احمد رقم طراز ہیں:

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"وہ نہ جمہور کا شاعر ہے، نہ عوام کا، نہ قصیدہ گو ہے، نہ سرکاری شاعر، نہ مصورِ فطرت ہے، نہ شاعرِ انقلاب، وہ تو بس شاعر ہے، خالی شاعر، اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"73

یہ اقتباس اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے کہ منیر نیازی کسی مخصوص نظریاتی وابستگی کے بجائے خالص تخلیقی وجدان اور انسانی احساس کے نمائندہ فنکار ہیں۔ ان تنقیدی شواہد کی روشنی میں جب ہم منیر نیازی کے مخصوص شعری موضوعات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے ہاں فطرت کے مظاہر گہرے انسانی تجربات کا استعارہ بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کے ہاں برسات کا موضوع محض موسمی تبدیلی نہیں بلکہ ماضی کی یادوں اور انسانی تعلقات کو بیدار کرنے والا محرک ہے۔ نظم "برسات" میں طوفان اور تیرگی کے پس منظر میں بزمِ حادثات کا منظر یوں ابھرتا ہے:

"آہ! یہ بارانی رات
میہ، ہوا، طوفان، رقصِ صاعقات
شش جہت پر تیرگی اُمڈی ہوئی
ایک سناٹے میں گم ہے بزم گاہِ حادثات"74

برسات کے اس ماحول کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو شاعر کا شعور ماضی کے فراموش شدہ احوال سے جڑ جاتا ہے اور وہ شور کے درمیان بھی ایک اندھیری اور بتیسی یاد سے جڑا رہتا ہے:

"آسمان پر بادلوں کے قافلے بڑھتے ہوئے
اور مری کھڑکی کے نیچے ناچتے پیڑوں کے بات
چار سو آوارہ ہیں
بھولے بسرے واقعات
جھگڑوں کے شور میں
جانے کتنی دور سے
سن رہا ہوں تیری بات"75

یہ اشعار اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ برسات کے مستقل موضوع میں ماضی کے واقعات، انسانی تعلق اور یاد کی کیفیات باہم مربوط ہو کر معنوی دائرے کو وسعت دیتے ہیں۔ اسی طرح نظم "شبِ ویران" میں رات، سنسان چاند اور یوکلپٹس کے خشک پتے انسان کی داخلی اداسی اور اکلاپے کے مظہر بن کر سامنے آتے ہیں:

"یوکلپٹس کے پیڑ کے اُوپر
ٹھٹھرے تاروں کے پھیلے جنگل میں
چاند تنہا اداس پھرتا ہے
یوکلپٹس کی سرد شاخوں سے
ٹھنڈے جھونکے لپٹ کے روتے ہیں
یوکلپٹس کے پیڑ کے نیچے
خشک پتے ہوا میں اُڑتے ہیں"76

نظم کا یہ شعری منظر نامہ بتاتا ہے کہ منیر نیازی کے ہاں شب، چاند اور درخت جیسے فطری مناظر انسان کی باطنی تنہائی اور اداسی سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

تنہائی اور داخلی کرب منیر نیازی کے موضوعاتی تنوع کا ایک اور بنیادی ستون ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "تیز ہوا اور تنہا پھول" اپنے عنوان ہی سے فرد کی انفرادیت اور معاشرتی فاصلے کو تجسیم کرتا ہے۔ اس مجموعے کے استعاراتی پس منظر کو واضح کرتے ہوئے امجد طفیل لکھتے ہیں:

"کتاب کا نام شاعر کی انفرادیت کو نمایاں کر رہا ہے۔ اور خود شاعر کو بھی اس بات کا شعوری ادراک حاصل ہے کہ اس کے ارد گرد کوئی بھی اس جیسا نہیں ہے۔"77

اس تجزیے کا حتمی حاصل یہ ہے کہ مجموعے کا نام ہی شاعر کی منفرد شخصیت اور اس کی داخلی و خارجی تنہائی کے ادراک کی علامت ہے۔ شاعر نے اپنی اس داخلی تنہائی کو محض ایک عارضہ نہیں سمجھا بلکہ اسے اپنی تخلیقی جہد اور اپنے تمام تجربات کی اساس قرار دیا ہے۔ کلیات میں ان کے اپنے الفاظ اس سچائی کا اعتراف کرتے ہیں:

"منیر نیازی کے پاس کیا تھا؟ کوئی سایہ دیوار بھی نہ تھا۔ صرف شعر کہنے کی دھن۔ یوں اپنے آپ کو تنہا اس نے اپنی زندگی کی ایک ایک تڑپ، اپنے تجربات کی ایک ایک کسک۔۔۔ اپنے سطور کے اندر رکھ دی۔"78

شاعر کا یہ ذات سے متعلق بیان یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی تنہائی ہی اس کے تخلیقی سفر کی حقیقی توانائی اور شعری واردات کا بنیادی حوالہ ہے۔ اسی شخصی تنہائی اور تخلیقی ریاضت کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے مجید امجد نے ان کے ضبط اور کرب کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"مری طرح کوئی اپنے لہو سے ہولی کھیل کے دیکھے
کالے کٹھن پہاڑ دکھوں کے سر پر جھیل کے دیکھے
میرے ہی ہونٹوں سے لگا ہے نیلے زہر کا پیالہ
میں ہی وہ دوہوں جس کی چتا سے گھر گھر ہوا اُجالا"79

مجید امجد کے ان اشعار کا گہرا مطالعہ یہ سچائی سامنے لاتا ہے کہ منیر نیازی کا ذاتی کرب، دکھ اور محرومی تخلیقی عمل کے بعد محض شخصی نہیں رہتے بلکہ ایک کائناتی اجالے اور اجتماعی انسانی معنویت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی نقطہ نظر کو مزید وسعت دیتے ہوئے اور اس تنہائی کی ہمہ گیری کو تسلیم کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"ہر اچھا فن کار تنہا ہی ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی صورتِ حالات پر قناعت نہیں کر سکتا، اس لیے تنہا ہے۔ وہ اس بدصورت دنیا میں خوب صورتیوں کا متلاشی ہے، اس لیے تنہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تنہائی کروڑوں ہم نفسوں اور ہم نصیبوں سے آباد ہوتی ہے۔"80

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ منیر نیازی کی تنہائی کوئی فرار یا انفرادی عزلت نہیں بلکہ دنیا کو خوبصورت بنانے کی تڑپ اور اجتماعی انسانی دکھوں سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔

ماضی کی بازیافت اور احساسِ وقت منیر نیازی کی موضوعاتی دنیا کی ایک اور اہم جہت ہے۔ ان کے ہاں ماضی کوئی جامد یا مردہ حقیقت نہیں بلکہ حال اور مستقبل کو روشن کرنے والی ایک زندہ قوت ہے۔ مؤرخ اور شاعر کے اس تفاوت کو ابھارتے ہوئے احمد ندیم قاسمی رقم طراز ہیں:

"منیر نیازی کے دل و دماغ میں بیشتر ماضی کی یادیں تحریک پیدا کرتی ہیں مگر یہ یادیں اتنی تابندہ اور پاکیزہ ہیں کہ ان کی بازیافت میں نہ حال کو کسی گزند کا احتمال ہے اور نہ مستقبل کو کسی نقصان کا خطرہ۔۔۔ مورخ کی بازیافت محض بازیافت ہے، شاعر کی بازیافت فن میں ڈھل کر پیش رفت کا کردار ادا کرتی ہے۔"81

اس فکر کا نچوڑ یہ ہے کہ منیر نیازی ماضی کو محض ایک بھولی ہوئی داستان کے طور پر یاد نہیں کرتے بلکہ اسے تخلیق کا ذریعہ بنا کر حال کے ادراک اور پیش رفت کا وسیلہ بناتے ہیں۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

نظم "ماضی" میں وہ ایک آباد مگر رفتہ دور کا تقابل موجودہ ویرانی سے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہاں ہر دریچہ
حسیں، ہمماتے، وفا کیش چہروں کی آماجگاہ تھا
یہ باغ ان گنت خوشبوؤں، چہچہاتے پرندوں،
گھنیرے درختوں کی اک دل نشیں جلوہ گر تھا۔
یہاں ایک دن تھا کہ شیریں صداؤں کے جھنڈ
آرزوؤں کے بھٹکے ہوئے قافلوں کے لیے راحتوں کے نشاں تھے۔
مگر آج جس سمت دیکھو
نگاہوں کے کشکول ہیں،
سونے بام و در و سقف،
سوکھے درختوں سے جھڑ کر گرے زرد پتوں، چٹختی ہوئی ٹہنیوں کے
سوا کچھ نہیں ہے!"82؎

ان اشعار سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ ماضی اور حال کا یہ تضاد اور تقابل وقت کی بے ثباتی اور تہذیبی رونقوں کے زوال کو جلی حروف میں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح نظم "چھ رنگین دروازے" میں وقت کے گزراؤ، گزشتہ بیتے دنوں کی گرفت اور مستقبل کے خدشات مل کر انسان کی وجودی بے یقینی کی عکاسی کرتے ہیں:

"آج کا دن کیسے گزرے گا کل گزرے گا کیسے
کل جو پیشانی میں بیتا وہ بھولے گا کیسے
کتنے دن ہم اور جئیں گے کام میں کتنے باقی
کتنے دکھ ہم کاٹ سکتے ہیں اور ہی کتنے باقی
خاص طرح کی سوچ تھی جس میں سیدھی بات گنوادی
چھوٹے چھوٹے وہموں ہی میں ساری عمر بتادی"83؎

یہ منظوم ٹکڑا یہ ثابت کرتا ہے کہ شاعر کے نزدیک وقت کی گردش، ماضی کے نقوش اور مستقبل کا خوف باہم مل کر انسان کی قلبی اور فکری بے یقینی کی تشکیل کرتے ہیں۔

ان کے موضوعاتی دائرے میں انسانی تعلقات، محبت کی نارسائی اور تاخیر کا احساس بھی بے حد نمایاں ہے۔ نظم "نارسائی" میں شاعر کا دل ایک دائمی کشکول لیے رفاقت اور محبت کی گدائی کرتا ہے:

"مرا دل محبت کا بھوکا
بلند، اونچے پیڑوں کے جنگل
میں چلتے ہوتے رہروؤں سے یہ کہتا ہے:
مجھ کو اُٹھالو۔۔۔۔۔۔۔۔۔
مجھے اپنے ساتھ اُن المناک رستوں میں لے کر چلو

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

جن میں ہر آرزو شام کی راگنی بن گئی ہے
جہاں ہر صدا بھیگے سایوں کی خاموش محراب میں چھپ گئی ہے
حسیں رہروو!
میں تمہارے اکیلے گھروں میں
تمہاری حزیں چاہتوں کے غم فروگیتوں پہ رویا کروں گا!
مرا دل محبت کا بھوکا
اسی طرح صدیوں سے چاہت کا کشکول لے کر
گھنے جنگلوں کے حسیں رہروؤں سے کہے جا رہا ہے:
مجھے ساتھ لے کر چلو
اجنبی راستوں پر بھٹکتے ہوئے اجنبی دوستو!"84؎

یہ نظم کھلے طور پر یہ رخ سامنے لاتی ہے کہ منیر نیازی کے ہاں محبت اور رفاقت کی طلب محض ایک عارضی کیفیت نہیں بلکہ انسان کے وجود کی ازلی نارسائی اور تنہائی کا غماز ہے۔ نظم "ایک خواہش" میں بھی سرد ہوا اور طوفانی شام کے ماحول میں ماضی کے رویوں کو یاد کرنے کی آرزو سامنے آتی ہے:

"یخ آلود، ٹھنڈی ہوا
بادلوں سے بھری شام ہو
اور طوفان زدہ بحر کی تند موجوں کی مانند
آوازیں دیتے ہوئے پیڑ ہوں
شہر کی سونی گلیوں میں اُڑتے ہوئے خشک پتے
اور ہم چپکے بیٹھے
کسی کی جفائیں، کسی کی وفا یاد کرتے ہوئے
اپنے بے چین دل کو سلاتے رہیں"85؎

ان اشعار کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر نے محبت کو محض ظاہری وصال کے بجائے یاد، محرومی اور داخلی سکون کی تلاش کے ساتھ پیوست کر دیا ہے۔ مزید بر آں، ان کی مشہور نظم "ساعتِ سیار" (ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں) میں "دیر" کو انسانی رویوں اور جذباتی تاخیر کے المیے کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

"ضروری بات کہنی ہو کوئی وعدہ نبھانا ہو
اسے آواز دینی ہو اسے واپس بلانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
مدد کرنی ہو اس کی، یار کی ڈھارس بندھانا ہو
بہت دیرینہ رستوں پر کسی سے ملنے جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
بدلتے موسموں کی سیر میں دل کو لگانا ہو

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کسی کو یاد رکھنا ہو کسی کو بھول جانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں
کسی کو موت سے پہلے کسی غم سے بچانا ہو
حقیقت اور تھی کچھ اس کو جا کے بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں"86؎

یہ نظم اس حقیقت کو حتمی معنویت عطا کرتی ہے کہ بروقت اقدام، احساس اور اظہار سے محرومی انسان کے لیے ناقابلِ تلافی ندامت اور رشتوں کے زوال کا سبب بن جاتی ہے۔

منیر نیازی کے موضوعات میں جہاں فرد کی داخلی دنیا شامل ہے، وہاں شہری زندگی کی بے حسی اور مکانی وسعت کے موضوعات بھی برابر اہمیت رکھتے ہیں۔ نظم "آدمی" میں وہ انسان کے ہجوم میں بھی تنہا رہنے کی نفسیاتی کیفیت کو پیش کرتے ہیں:

"بھولی باتیں یاد نہ آئیں کیا کیا کوشش کرتا ہے
کون ہے وہ بس اسی سوچ کے سائے سے بھی ڈرتا ہے
جیسے سکھ کے طوفانوں میں دکھ کا ریلا پھرتا
ساتھ اپنے جمگھٹا لگا کر آپ اکیلا پھرتا ہے"87؎

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی تنہائی محض خلوت کا نام نہیں بلکہ محفلوں میں رہتے ہوئے بھی اپنے دکھ اور اندیشوں کا بوجھ اٹھائے پھرنا ہے۔ نظم "ساحلی شہر میں ایک رات" میں جدید شہری فضا کی چمک دمک اور اس کے مقابلے میں پائی جانے والی سنگ دلی کا نقشہ کچھ یوں ہے:

"روشنیاں ہی روشنیاں اور نوحے تھکے جہازوں کے
بارش میں جادو کے منظر کھلے ہوئے دروازوں کے
لاکھ جتن سے بھی نہیں مانا
دل کو دکھایا بیتے دن کے ہنگاموں کا تماشا بھی
شہر ہے سارا پتھر جیسا
میرا بھی دشمن ہے یہ اور اس کے لہو کا پیاسا بھی
میں بھی اپنی سوچ میں گم ہوں
پاگل ہو کر ناچ رہی وہ ہوٹل کی رقاصہ بھی"88؎

یہ شعری ٹکڑا یہ ثابت کرتا ہے کہ جدید شہر کی ظاہری چمک کے پیچھے بے حسی، اجنبیت اور روحانی بے سکونی کا ایک پورا جہان آباد ہے۔ نظم "گرم رنگ پھولوں کا" میں رومانوی یادوں اور محرومی کا احساس نمایاں ہوتا ہے:

"گرم رنگ پھولوں کا
گرم تھی مہک ان کی
گرم خون آنکھوں میں
تیز تھی چمک اُن کی

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

سوچتا میں کیا اس کو
اُس حسیں کی باتوں کو
دیکھتا میں کیا اس کے
خاک رنگ ہاتھوں کو"89؎

یہ اشعار بتاتے ہیں کہ منیر نیازی کے ہاں محبت محض تحسین نہیں بلکہ ایک بیتے ہوئے لمحے کی تلخ یاد اور محرومی کا احساس ہے۔ جبکہ نظم "بے سود سفر کے بعد" میں فطرت، ماضی اور وقت کی گردش ایک دوسرے میں ضم دکھائی دیتے ہیں:

"پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر
پھر وہی خواب تمنّت، پھر وہی دیوار و در
بلبلیں، اشجار، گھر، شمس و قمر
خوف میں لذت کے مسکن جسم پر اُن کا اثر
موسموں کے آنے جانے کے وہی دل پر نشاں
سات رنگوں کے علم نیلے فلک تک پر فشاں
صبح دم سونے محلے بھی کی تھی کی سہ پہر
پھول گرتے دیکھنا شاخوں سے فرشِ شام پر
خواب اُس کے دیکھنا موجود بام پر
پھر ہری بیلوں کے نیچے بیٹھنا شام و سحر"90؎

اس نظم کی پرکھ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وقت کی گردش اور فطرت کے بدلتے مظاہر انسان کے حافظے میں ماضی کی یادوں کو مسلسل متحرک رکھتے ہیں۔ منیر نیازی کی اس مکانی و کونیاتی وسعت کا جائزہ لیتے ہوئے سہیل احمد رقم طراز ہیں:

"یہ ایک مسلسل سفر کی کائنات ہے اور یہ سفر اس کائنات کو پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں اور غزلوں کا یہ نیا منطقہ ہمیں ایک نئی کونیات سے دوچار کر رہا ہے۔"۱۹۰؎

سہیل احمد کے اس قول کا گہرا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ منیر کی شاعری محدود اور بند فضاؤں سے نکل کر ایک کھلی کائناتی اور مکانی وسعت کی طرف پیش رفت کرتی ہے۔ اسی جلاوطنی اور یادِ ماضی کے گہرے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"منیر نیازی کی شاعری ایک طویل جلاوطنی کے بعد وطن کی پہلی جھلک دیکھنے سے مماثلت رکھتی ہے۔ اس شاعری میں حیران کر دینے اور بھولے ہوئے گم شدہ تجربوں کو زندہ کرنے کی ایک ایسی غیر معمولی صلاحیت ہے جو اس عہد کے کسی دوسرے شاعر میں نظر نہیں آتی۔"91؎

یہ تنقیدی رائے اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ منیر نیازی کے ہاں گم شدہ تجربات اور ماضی کی بازیافت ان کی شعری شناخت اور موضوعاتی وسعت کا اصل جوہر ہے۔

شاعر کے فکری ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو ان کے بعد کے شعری مجموعوں میں مذہبی، قومی، خاندانی اور اجتماعی موضوعات کا اضافہ نمایاں نظر آتا ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" میں وہ وفات کے بعد بھی ماں کی معنوی و روحانی موجودگی کو کچھ یوں محسوس کرتے ہیں:

"میں نے جن مکانوں میں
زندگی کے اچھے یا برے دن کاٹے ہیں
وہ وہاں موجود ہے۔"92

ان اشعار کی تہوں میں اترنے سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ ماں کا وجود اور اس کی یاد موت کی سرحدوں کو پار کر کے بھی مکان اور زندگی کے ہر تجربے کا حصہ بنی رہتی ہے۔ اسی طرح "انتخاب: حضورؐ کے نام" کی حمدیہ نظمیں، "شہیدِ کربلا کی یاد میں" اور حسینیت کا موضوع اس روحانی شعور کی گواہی دیتے ہیں جہاں حسینؓ کی ذات حق، روشنی اور تعمیر کی علامتی سچائی بن کر سامنے آتی ہے:

"روشن ہے اس کے دم سے الم خانۂ جہاں
خدائے عصر کی تنویر ہے حسین
ہے اس کا ذکر شہر کی مجلس میں رہنما
اجڑے نگر میں حسرتِ تعمیر ہے حسین"93

یہ اشعار ثابت کرتے ہیں کہ حسینیت منیر نیازی کے ہاں محض رسمی عقیدت نہیں بلکہ زوال پذیر معاشرے میں ظلم کے خلاف اخلاقی استقامت اور تعمیر کی امید ہے۔ ان کے بعد کے کلام میں پیدا ہونے والے اس کو نیاتی، مذہبی اور روحانی سفر کو نمایاں کرتے ہوئے سہیل احمد لکھتے ہیں:

"منیر اپنی بعض تازہ نظموں میں چاند سے سورج کی طرف سفر کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور ان نظموں
میں سورج اور اس کی چمک کے تلازمات ظاہر ہو رہے ہیں۔۔۔ کائنات کا پھیلاؤ مظاہر سے آگے کسی عظیم
تر حقیقت کے ادراک کے مرحلے سے بھی دوچار کرتا ہے۔"94

سہیل احمد کا یہ خیال بتاتا ہے کہ منیر نیازی کا تخلیقی شعور اب صرف مظاہرِ فطرت تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ ان کے پسِ پردہ موجود عظیم تر اور آفاقی سچائیوں کا ادراک کر رہا ہے۔ اسی اجتماعی و قومی دھارے میں نظم "اپنے شہروں کے لیے دعا" میں ملک کے تمام شہروں کی سلامتی کی التجا کی گئی ہے:

"پاکستان کے سارے شہرو!
زندہ رہو! پائندہ رہو!
روشنیوں، رنگوں کی لہرو!
زندہ رہو! پائندہ رہو!"95

یہ بند اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ ان کا موضوعاتی دائرہ انفرادی ذات کے خول سے نکل کر قومی بقا، شادابی اور اجتماعی سلامتی کا ضامن بن چکا ہے۔ جبکہ نظم "جنگ کے سائے میں جنتِ ارضی کا خواب" اور "بارشوں کا موسم" جیسے موضوعات میں جنگ کی خوفناک فضا کے باوجود امن، دیہی حسن اور شادابی کی تمنا ابھرتی ہے:

"کھلی، چٹیل زمینوں سے
غبارِ شام میں اُڑتی
صدائیں گھر کو واپس آ رہے مسرور لوگوں کی
افق تک کھیت سرسوں کے
گلاب اور سبز گندم کے

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

عجب حیرانیاں سی ہیں
مکانوں اور مکینوں میں
کہ موسم آ رہا ہے گاؤں کے جنگل مہکنے کا"96؎

یہ اشعار یہ حقیقت واضح کرتے ہیں کہ جنگ کے اندیشوں کے مقابلے میں انسانی امن، معمولاتِ زندگی اور فطرت کا حسن اپنا پُر اثر وجود قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح نظم "بارشوں کا موسم" میں بھی فطرت اور ماضی کا گہرا باہمی تعلق سامنے آتا ہے:

"اس کو یاد ہے جیسے
بات اُس زمانے کی
دھوم اس کے دل میں ہے
ان دنوں کے آنے کی"97؎

یہ مختصر بند اس بات کا مظہر ہے کہ ان کے ہاں فطرت کے موسمی مناظر ماضی کی دیرینہ یادوں کو ابھارنے اور آئندہ کی امید جگانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

منیر نیازی کی نظموں میں موضوعاتی تنوع کا یہ پورا سلسلہ دراصل قیامِ پاکستان کے بعد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا شاعرانہ ردِ عمل بھی ہے۔ مارشل لا کے ادوار، جبر و استبداد، اور اخلاقی و معاشی انحطاط کے جس ماحول نے جنم لیا، منیر کی شاعری اس کے اثرات کو سمیٹتی ہے۔ اس تاریخی تناظر اور معاصر شعری ورثے کی وضاحت کرتے ہوئے رشید امجد اور فاروق علی تحریر کرتے ہیں:

"قیام پاکستان سے ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء تک اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۸ء کی عوامی تحریک تک آمریت اور جبر و استبداد کا ایک ڈرامہ مختلف شکلوں اور کرداروں کے توسط سے کھیلا جاتا رہا جس کے نتیجے میں معاشرہ سماجی تہذیبی اور اخلاقی انحطاط سے ہمکنار ہوا۔ نئے شاعر کو عصری مسائل میں عدم معاشی مساوات اور سیاسی جبریت ورثہ میں ملے۔ اس نے یہ ساری صورت محسوس کی اور مختلف وسیلوں سے اس کا اظہار کرتا رہا۔"98؎

اس تاریخی تجزیے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ منیر نیازی کی داخلی بے چینی اور تنہائی کوئی ہوا میں قائم شدہ کیفیت نہیں بلکہ ان کے عہد کی آمریت، عدم مساوات اور تہذیبی بحران کا حقیقی عکس ہے۔ ان تمام موضوعاتی جہتوں، یعنی داخلی کرب، تنہائی، فطرت، ماضی، شہری بے حسی، مذہبی شعور، اور عصری جبر کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ منیر نیازی نے اردو نظم کے موضوعاتی دائرے کو غیر معمولی وسعت عطا کی ہے۔ اردو شاعری کے ارتقائی تسلسل اور متوازی ادوار کے تناظر میں ان کا مقام متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

"فکر و فن کی سطح پر ہم اردو شاعری کو پانچ خاص رُتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی رُت کے ممتاز ترین شاعر میر تقی میر، دوسری کے غالب، تیسری رُت کے خالق اقبال، چوتھی کے فیض اور میراجی اور پانچویں رُت جسے آج کی شاعری کہنا زیادہ مناسب ہو گا، اس کے خالق منیر نیازی ہیں۔"99؎

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ حتمی موقف یہ تسلیم کرتا ہے کہ منیر نیازی نے جدید دور کی شاعری کا ایک نیا افق پیش کیا ہے جس کی بنیاد ان کا منفرد موضوعاتی تنوع اور جدید وجودی تجربات ہیں۔ حاصلِ بحث یہ ہے کہ منیر نیازی کی نظموں کا موضوعاتی تنوع محض موضوعات کی کثرت یا ان کا ظاہری مظاہرہ نہیں، بلکہ جدید انسان کے پیچیدہ وجود، داخلی تنہائی، کائناتی تعلق اور عصری بحران کی ایک ہمہ گیر اور جمالیاتی ترجمانی ہے جو ان کی شاعری کو اردو نظم کی تاریخ میں ایک منفرد اور دائم قائم مقام عطا کرتی ہے۔

AL-AASAR Journal
Quarterly *Research Journal*
www. al-aasar.com
Vol. 3, No.1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

زیرِ نظر تحقیقی مقالہ "جدید اردو نظم میں موضوعاتی تنوع۔۔۔ایک تحقیقی اور تنقیدی جائزہ" اسی وسیع ادبی اور فکری تناظر میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد بیسویں صدی کی جدید اردو نظم میں موجود موضوعاتی تنوع کا جائزہ لینا، مختلف شعرا کے فکری رجحانات کی نشان دہی کرنا اور ان کے ہاں موضوعات کے انتخاب و اظہار کے اسالیب کا تنقیدی مطالعہ کرنا ہے۔ اس ضمن میں جدید اردو نظم کے ارتقائی مراحل، مختلف ادبی تحریکوں کے اثرات اور بدلتے ہوئے سماجی و تہذیبی حالات کے تناظر میں نظم کے موضوعاتی امکانات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ یہ واضح کیا جا سکے کہ جدید اردو نظم محض ایک شعری صنف نہیں بلکہ اپنے عہد کے اجتماعی شعور، انسانی تجربات، فکری تبدیلیوں اور تہذیبی صورتِ حال کی بھرپور عکاس بھی ہے۔ اختتامیہ

زیرِ نظر تحقیقی و تنقیدی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بیسویں صدی جدید اردو نظم کے ارتقا، وسعت اور موضوعاتی تنوع کے حوالے سے ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل صدی ہے۔ اگرچہ جدید نظم کے ابتدائی رجحانات تحریکِ علی گڑھ کے زیرِ اثر سامنے آئے، تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس صنف نے مختلف فکری، سماجی اور ادبی تحریکوں کے زیرِ اثر اپنی شناخت کو مزید مستحکم کیا۔ اس دوران نظم روایتی موضوعات کی محدود فضا سے نکل کر زندگی کے وسیع تر مسائل اور انسانی تجربات کی ترجمان بن گئی۔ جدید اردو نظم نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور نفسیاتی حالات کو نہ صرف موضوع بنایا بلکہ ان کے باطن میں پوشیدہ انسانی کرب، احساسات اور فکری پیچیدگیوں کو بھی فن کارانہ انداز میں پیش کیا۔

اس صدی کے شعرا نے موضوعات کے انتخاب میں غیر معمولی وسعت اور تنوع کا مظاہرہ کیا۔ ترقی پسند شعرا نے سماجی ناانصافی، طبقاتی تقسیم، استحصال، غربت، آزادی اور انسانی مساوات جیسے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا، جب کہ جدیدیت کے نمائندہ شعرا نے فرد کی داخلی دنیا، تنہائی، بے یقینی، وجودی مسائل، ذات کی شکست و ریخت اور انسانی شعور کی پیچیدگیوں کو نظم کے ذریعے اظہار بخشا۔ اسی طرح قومی و ملی جذبات، حب الوطنی، جنگ و امن، ہجرت، تقسیمِ ہند، تہذیبی زوال، فطرت، محبت، رشتوں کی معنویت اور انسانی زندگی کے متنوع تجربات بھی جدید اردو نظم کے اہم موضوعات قرار پائے۔ ن۔م۔ راشد، میراجی، فیض احمد فیض، اختر الایمان، مجید امجد، منیر نیازی اور دیگر اہم شعرا کی تخلیقی کاوشیں اس امر کی گواہ ہیں کہ جدید اردو نظم نے موضوعاتی سطح پر اپنی وسعت کے ساتھ ساتھ اظہار و ابلاغ کے نئے امکانات بھی پیدا کیے۔

حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ جدید اردو نظم کا موضوعاتی تنوع دراصل بدلتے ہوئے انسانی شعور، سماجی صورتِ حال اور تہذیبی ارتقا کا تخلیقی اظہار ہے۔ بیسویں صدی کے نظم نگاروں نے اپنے اپنے عہد کے مسائل، احساسات، فکری میلانات اور تجربات کو جس تنوع اور فنی مہارت کے ساتھ نظم کا حصہ بنایا، اس سے اردو نظم کا دائرۂ اظہار غیر معمولی طور پر وسیع ہوا۔ جدید اردو نظم کی اہمیت صرف اس کے موضوعات کی کثرت میں نہیں بلکہ اس حقیقت میں بھی پوشیدہ ہے کہ اس نے انسان اور کائنات، فرد اور معاشرہ، ماضی اور حال، روایت اور جدت کے باہمی رشتوں کو نئے زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کا شعور عطا کیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی جدید اردو نظم کے لیے محض ایک تاریخی عہد نہیں بلکہ فکری بالیدگی، موضوعاتی وسعت اور تخلیقی تنوع کا ایک بھرپور زمانہ ہے، جس کے اثرات اردو نظم کے بعد کے ادبی سفر میں بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

1) ذوالفقار احسن، شکیب جلالی: ایک مطالعہ، لاہور: اظہار سنز، ۲۰۰۹ء، ص ۶۶۔
2) ایضاً، ص ۱۳۹۔
3) شکیب جلالی، کلیات شکیب جلالی، لاہور: المکتبۃ الفیصلیۃ، ۲۰۰۷ء، ص ۵۵۴۔
4) ایضاً، ص ۵۴۵۔
5) ایضاً، ص ۵۴۵۔
6) ایضاً، ص ۵۴۵۔
7) ایضاً، ص ۵۴۵۔
8) ایضاً، ص ۵۴۵۔

9) مرزا حامد بیگ، مصطفیٰ زیدی کی کہانی، لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، ۱۹۹۳ء، ص ۴۶۔
10) مصطفیٰ زیدی، روشنی (پیش لفظ: چراغ آفریدم)، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۔
11) مصطفیٰ زیدی، کلیاتِ مصطفیٰ زیدی (روشنی)، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۰-۱۰۹۔
12) مصطفیٰ زیدی، کلیاتِ مصطفیٰ زیدی (شہر آذر)، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۱۰-۹۔
13) ایضاً، ص ۷۔
14) ایضاً، ص ۳۲-۳۱۔
15) ایضاً، ص ۳۴۔
16) سید عامر سہیل، "جدید اردو شاعری میں مجید امجد کی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۳۔
17) محمد زکریا خواجہ (مرتب)، کلیات مجید امجد، لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۲۴ء، ص ۱۱۴۔
18) ایضاً، ص ۱۱۵۔
19) ایضاً، ص ۱۱۹۔
20) ایضاً، ص ۱۳۵۔
21) مجید امجد، کلیات مجید امجد، مرتب کردہ: محمد زکریا خواجہ، لاہور: زاہد بشیر پرنٹرز، ۲۰۲۴ء، ص ۲۲۶۔
22) ایضاً، ص ۳۱۷۔
23) ظہور نظر، کلیات ظہور نظر، ملتان: روحانی آرٹ پریس، ۱۹۸۷ء، ص ۶۹-۶۷۔
24) ایضاً، ص ۶۹۔
25) ایضاً، ص ۱۳۳۔
26) ایضاً، ص ۱۳۳۔
27) ایضاً، ص ۱۷۱۔
28) ایضاً، ص ۱۲۱-۱۲۰۔
29) ایضاً، ص ۱۲۱۔
30) ایضاً، ص ۱۱۵-۱۱۴۔
31) نوشی گیلانی، "بہادر شاعر"، مشمولہ: ظہور نظر: وفا کا سفر، ملتان: روحانی آرٹ پریس، ۱۹۸۷ء، ص ۳۔
32) ایضاً، ص ۳۔
33) قمر رئیس، "فیض کا فن شاعری"، مشمولہ: فیض احمد فیض، فن اور شخصیت (فیض احمد فیض نمبر)، مدیر: صابر دت، شمارہ ۷ تا ۱۲، بمبئی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۸۔
34) احسن کمال، "فیض کا فن شاعری"، مشمولہ: فیض احمد فیض: فن اور شخصیت (فیض احمد فیض نمبر)، مدیر: صابر دت، شمارہ ۷ تا ۱۲، بمبئی، ۱۹۸۱ء، ص ۴۵۔
35) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دست تہ سنگ)، لاہور: مکتبہ کارواں، ص ۴۶۴۔
36) ایضاً، ص ۴۶۵۔

37) فیض احمد فیض، "تمہارے حسن کے نام"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، ص۱۹۵۔
38) فیض احمد فیض، "صبح آزادی"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، ص۱۹۰۔
39) فیض احمد فیض، "تمہارے حسن کے نام"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، ص۱۹۷۔
40) فیض احمد فیض، "نثار میں تری گلیوں کے اے وطن"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، ص۲۰۰۔
41) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دست تہ سنگ)، لاہور: مکتبہ کارواں، ص۳۶۶۔
42) فیض احمد فیض، "نثار میں تری گلیوں کے اے وطن"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، ص۱۹۹۔
43) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دست تہ سنگ)، لاہور: مکتبہ کارواں، ص۳۳۵۔
44) فیض احمد فیض، "نظم"، مشمولہ: فن اور شخصیت (فیض احمد فیض نمبر)، ص۲۰۵۔
45) فیض احمد فیض، "زنداں کی ایک شام"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، ص۲۰۴۔
46) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، ص۲۱۸۔
47) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲ء، ص۴۷۰۔
48) فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (دست تہ سنگ)، لاہور: مکتبہ کارواں، ص۳۰۶۔
49) ایضاً، ص۴۱۱۔
50) ایضاً، ص۴۶۴۔
51) ایضاً، ص۵۳۲۔
52) ایضاً، ص۵۳۱۔
53) ایضاً، ص۵۵۱۔
54) علی احمد فاطمی، فیض ایک نیا مطالعہ، الہ آباد: ادارہ نیا سفر، ۲۰۱۲ء، ص۳۷۔
55) ایضاً، ص۳۷۔
56) احمد ندیم قاسمی، "فیض کا فن شاعری"، مشمولہ: فیض احمد فیض: فن اور شخصیت، شمارہ ۷ تا ۱۲، بمبئی، ۱۹۸۱ء، ص۱۹۔
57) سیدہ جعفر، "فن اور شخصیت"، مشمولہ: فیض احمد فیض نمبر، مرتبہ: ممتاز شیریں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص۳۷-۳۶۔
58) نند کشور کرم (مدیر)، عالمی اردو ادب (حبیب جالب نمبر)، جلد ۹، ۱۹۹۴ء، پبلیشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی، ص۹۔
59) عبادت بریلوی، "نظریہ کا شاعر"، مشمولہ: عالمی اردو ادب (حبیب جالب نمبر)، جلد ۹، ۱۹۹۳ء، ص۳۴۔
60) زیر نگاہ، "رودادِ وفادار پہ"، مشمولہ: عالمی اردو ادب (حبیب جالب نمبر)، جلد ۹، ۱۹۹۴ء، ص۳۴۔
61) حبیب جالب، کلیات حبیب جالب، لاہور: طاہر زیدی، رانا پریس، ۲۰۱۲ء، ص۱۴۰۔
62) ایضاً، ص۱۷۵۔
63) ایضاً، ص۱۵۸۔
64) ایضاً، ص۱۴۲۔
65) ایضاً، ص۱۶۹۔

66) ایضاً، ص۱۴۷۔
67) ایضاً، ص۱۷۸۔
68) ایضاً، ص۲۹۳۔
69) ایضاً، ص۴۰۵۔
70) مجید امجد، "منیر نیازی کی شاعری"، بحوالہ: امجد طفیل، منیر نیازی: شخصیت اور فن، لاہور: اکادمی ادبیات پاکستان، ص۱۲۵-۱۲۴۔
71) احمد ندیم قاسمی، "منیر نیازی کی شاعری"، بحوالہ: امجد طفیل، منیر نیازی: شخصیت اور فن، لاہور: اکادمی ادبیات پاکستان، ص۱۲۶۔
72) ایضاً، ص۱۲۷۔
73) امجد طفیل، پیش لفظ، کلیات منیر، لاہور: اے این اے پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۳-۱۲۔
74) اشفاق احمد، "سر کہسار"، مشمولہ: کلیات منیر، لاہور: اے این اے پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۸۔
75) منیر نیازی، "برسات"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۹۔
76) ایضاً، ص۹۔
77) منیر نیازی، "شب ویران"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۱۔
78) امجد طفیل، منیر نیازی: شخصیت اور فن، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص۲۰۔
79) منیر نیازی، "جنگل میں دھنک"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۹۸۔
80) مجید امجد، بحوالہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۹۔
81) احمد ندیم قاسمی، "منیر کی منور شاعری"، مشمولہ: کلیات منیر، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۔
82) ایضاً، ص۱۱۔
83) منیر نیازی، "جنگل میں دھنک"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۔
84) منیر نیازی، "چھ رنگین دروازے"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۳۳۔
85) منیر نیازی، "جنگل میں دھنک"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۲۱۔
86) منیر نیازی، "جنگل میں دھنک"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۳۳۔
87) منیر نیازی، "ساعت سیار"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۲۴۔
88) منیر نیازی، "دشمنوں کے درمیان شام"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: الاشراق کمپوزنگ سنٹر / اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۷۔
89) ایضاً، ص۱۹۔
90) ایضاً، ص۳۹۔
91) ایضاً، ص۴۱۔
92) سہیل احمد، "کھلے منظروں کی دنیا"، مشمولہ: کلیات منیر، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۱-۱۰۔
93) ایضاً، ص۹۔
94) منیر نیازی، "ساعت سیار"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص۱۳۔

95) ایضاً، ص ۱۲۔

96) سہیل احمد، "کھلے منظروں کی دنیا"، مشمولہ: کلیات منیر، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص ۹۔

97) منیر نیازی، "ماہ منیر"، مشمولہ: کلیات منیر نیازی، لاہور: اے این پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۶۔

98) رشید امجد و فاروق علی، نیا پاکستانی ادب، راولپنڈی: گورنمنٹ کالج، مئی ۱۹۸۱ء، ص ۲۸۷۔

99) فرمان فتح پوری، پہچان، الہ آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۴۔